بھیڑیے بھی بھاگ گئے۔ تو اب پہاڑ کی چوٹی پر بھیڑیوں کا معزول چودھری۔ بگھیرا اور زلفی بیٹھے رہ گئے۔ اس وقت زلفی کو اندر ہی اندر بے چینی سی معلوم ہوئی۔ اس سے پہلے اس طرح کی تکلیف اس کو کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ دو چار سسکیاں لے کر زار و قطار رونے لگا۔ اور چیخیں مار مار کر بگھیرے سے کہنے لگا: "بھائی بگھیرے بھائی بگھیرے! بتاؤ تو سہی یہ مجھے کیا ہوا۔ جنگل سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ میری آنکھوں سے کیا نکلتا ہے۔ کہیں میں مرتا تو نہیں۔ بھائی بگھیرے بھائی بگھیرے ہو ہو ہو؟"

بگھیرا بھی رونے لگا۔ اور سیاہ بالوں کے ٹکڑوں پہ آنسوؤں کی دو موٹی موٹی بوندیں ڈھلک کر زمین پر گریں۔ پنجے سے آنکھیں پونچھ کر بولا۔ "نہیں پیارے نہیں۔ اس کو مرنا نہیں کہتے ہیں۔ یہ وہ آنسو ہیں جو ہر جاندار رو دیا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اب تم سمجھدار ہو گئے۔ نادان بچے نہیں رہے۔ جنگل بے شک آج تم سے چھوٹتا ہے۔ اس کا صدمہ ہم سے زیادہ کس کو ہوگا۔ اتنے پریشان و مضطرب نہ ہو۔ ان آنسوؤں کو بہ جانے دو۔ پھر جی ٹھہر جائے گا۔"

اس سے پہلے زلفی نہ جانتا تھا کہ آنسو کیا ہوتے ہیں۔ پر آج تو وہ ایسا چوکا اور ہوکا رویا۔ کہ جنگل میں ایسا کوئی نہ رویا ہوگا۔

جب رو دھو کر ذرا دل ٹھہرا تو بولا "لو بھائیو۔ اب ہم آدمیوں میں جاتے ہیں۔ تم سب کو جنگل کے سپرد کیا۔ پر پہلے اپنی ماں سے جس کا دودھ پیا ہے مل لوں"۔

یہ کہہ زلفی اُٹھا۔ اور بہت غم زدہ بھٹ کی طرف چلا۔ اور ماں کے گلے لگ کر خوب رویا۔ باوا جان بھیڑیئے نے آب دیدہ ہو کر گلے لگایا۔ اور زلفی نے رو رو کر ان کا سارا باران کوٹ بھگو دیا۔ چھوٹے بھائی بھیڑیوں نے جو سُنا۔ کہ بھیا جنگل سے چلا جائے گا۔ تو خوب چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ زلفی ایک ایک بھائی کو گلے لگا کر سمجھاتا تھا۔ اور ان سے بار بار کہتا تھا۔ کہ "بھائیو۔ دیکھو ہم کو بھول نہ جانا"۔

بھیڑیئے بھائی۔ واہ بھائی۔ ہم تم کو کیونکر بھول سکتے ہیں۔ آپ اس کا وعدہ کیجئے۔ کہ کبھی کبھی پہاڑ کے نیچے آیا کیجئے گا۔ پھر ہم بھٹ سے نکل کر آپ سے ملنے آیا کریں گے۔ اور رات کو سب مل کر کھیتوں میں خوب کھیلا کریں گے۔ کیوں بھائی۔ کیوں بھائی کیوں۔ تم اتنا کیوں روتے ہو۔ ہُو ہُو ہُو!

ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں۔ رو رو کر زلفی کے مُنہ سے اپنا مُنہ ملتی تھی۔ ماتھا چاٹ چاٹ کر پنجوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرتی تھی۔ اور کہتی تھی "بیٹا جاتے تو ہو۔ پر ہمیں

کو بھول نہ جانا۔ تمہارے باوا بڈھے ہو گئے ہیں۔ وہ اسی غم میں اپنا جی کھو دیں گے۔ گو تم آدمی کے بچے تھے۔ پر جنگل جانتا ہے کہ تمہارے سامنے اپنے پیٹ کی ماتا کی بھی کچھ حقیقت نہ سمجھی۔ ہُو ہُو ہُو!

زُلفی۔ نہیں اماں۔ میں ضرور ضرور آؤں گا۔ اور اب کے جب آؤں گا۔ تو اس شیر خاں موذی کی کھال کھینچ کر ساتھ لاؤں گا۔ اور بڑ چوڑا والی چٹان پر اس کو بچھا کر بھیڑیوں سے۔ دار کو اس پر بٹھاؤں گا۔ اماں دیکھنا تمہارے پیچھے جنگل کے ڈھونڈے لگے رہتے ہیں کہیں مجھکو بھول نہ جانا۔ نہیں تو میں مر جاؤں گا۔ لو اب میں جاتا ہوں۔ جنگل والوں سے کہہ دینا۔ کہ زُلفی تم سب کو یاد کرتا ہوا جنگل سے رخصت ہوا۔ ہُو ہُو ہُو!

اس رونے پیٹنے اور رخصت ہونے میں صبح کے آثار مشرق سے ظاہر ہوئے۔ اور ہمارا زلفی افسردہ دل خستہ حال آنکھوں میں آنسو دل میں درد پہاڑ سے اُترا۔ تاکہ ان جانوروں میں بود و باش اختیار کرے۔ جن کو دنیا میں انسان کے نام سے پکارتے ہیں ٭

پیارے لڑکو

جنگل کی پہلی کہانی ختم ہوئی۔ تم جی میں خفا ہوگے۔ کہ شیر کو جیتا چھوڑ دیا۔ اور زلفی کا حال آگے کچھ نہ سُنایا۔ ایک ایک سے پوچھوگے۔ کہ "پھر کیا ہوا" پھر کا حال تو یہ ہے۔ کہ زلفی خدا کے فضل سے اب تک زندہ سلامت ہے۔ جنگل میں اس نے بڑے بڑے کام کئے۔ ہر ایک کام کی ایک جُدا کہانی ہے۔ اگر اس کہانی کو پسند کیا۔ تو اَور کہانیاں بھی سُنائیں گے۔ کہانیاں سُنانے والے تو بہت ہیں۔ پر کوئی دل سے سُناتا ہے۔ کوئی اوپرے دل سے۔ اب تم ہی کہو یہ کہانی کیسی محنت سے لکھ کر تمہیں سُنائی ہے۔ جہاں کہیں سمجھ میں نہ آئے۔ مجھ پر خفا نہ ہونا۔ کسی بڑے سے مطلب پُوچھ لینا۔

جنگل کی دوسری کہانی

جنگل کی دُوسری کہانی

بھالُوجی کا پاٹھشالہ

یہ تو آپ جنگل کی پہلی کہانی میں پڑھ چکے ہونگے - کہ بھیڑیوں کی
بے وفائی سے بیزار ہو کر زلفی جنگل سے رخصت ہوا - مگر جو حال ہم اِس
کہانی میں لکھتے ہیں وہ اس سے کئی برس پہلے کا ہے - یہ وُہ زمانہ ہے
کہ زُلفی پورا چھ برس کا ہو کر ساتویں میں لگا ہے - اور بھالُوجی کے
سامنے بیٹھا سبق سُنا رہا ہے ⁘

بیٹھے بٹھائے شامت جو آئی تو بھُورے بندروں سے یارانہ جا
گانٹھا ، ایک دِن بے خبر پڑا سوتا تھا - کہ بہت سے بندر آئے - اور
موقع پا کر اس کو اُٹھا لے گئے - آگے پڑھیےگے - تو معلوم ہوگا کہ بھالُو

ی اور بگھیرے نے اس کے پیچھے کہاں کہاں کی خاک چھانی کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھائیں۔ اور کس کس جتن سے اس کو بندروں کی قید سے چھڑا کر لائے ۔

ہاں تو بھالو جی جنگل کے پُرانے اُستاد اور اُن کے پڑھانے کا ڈھنگ بھی سب سے نرالا۔ کسی مندر یا شوالے میں تو آپ کا گذر کہاں ہوتا۔ بن کے بیچوں بیچ ایک پُرانے پیپل کی جڑ میں جا بیٹھتے۔ اور سامنے ہری ہری دُوب پر بھیڑیوں کے لونڈوں کا پاٹ شالہ جما لیتے تھے۔ پاٹ شالہ کاہے کو ہوتا تھا۔ بس صحرائی لڑکوں کا دنگل سمجھئے۔ خیر دنگل ہو یا پاٹ شالہ۔ اب تو جنگل میں یہی ایک جگہ رہ گئی تھی۔ جہاں سے درندوں کی اولاد لائق فائق ہو کر نکلتی تھی ۔

سبق تو خُدا جانے یہ لڑکے کیونکر یاد کرتے تھے۔ مگر کشتیاں لڑ کر غل مچانے کا تو یہ حال تھا۔ کہ پیڑوں پر سے شہد کی مکھیاں تک چھتے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جاتی تھیں۔ اور جب تک بھالو جی ایک آدھ لونڈے کو ٹھونک پیٹ کر تختہ نہ بنا ڈالتے۔ کوئی لڑکا دُم سمیٹ کر دب سے نہ بیٹھتا تھا ۔

بی قہرن نے میاں سے مشورہ کر کے لڑکے کو ریچھ کے حوالے کر دیا تھا۔ ریچھ کو بھی زلفی کی طرف خاص توجہ تھی۔ اس کی وجہ یہ

نے مجبور کیا۔ کہ جہاں ایک کہانی لکھی ہے۔ وہاں دُوسری بھی سہی ۔

پہلی کہانی کا لُطف تو شاید اس کہانی میں نہ آئے۔ کیونکہ ترجمہ کی دقتوں نے اس تحریر کے رنگ کو پہلی تحریر سے کسی قدر مختلف کر دیا ہے۔ اکثر جگہ بندروں کا ذکر ہے۔ اور یہ مضمون وہ ہے۔ جس کے لئے مصنف ہی کی زبان کچھ مناسب وضع ہوئی ہے۔ مترجم کی زبان میں وہ تلوّن وہ تغیر وہ بے قراری اور اضطراب کہاں؟ محض صوتِ الفاظ اور فقرہ کی چست بندش سے کانوں میں شور اور آنکھوں میں جست وخیز کی تصویر پھر جانی بلکہ خود دھینگا مشتی پر طبیعت کا آمادہ ہو جانا کچھ انگریزی زبان ہی کا حق ہے اُردو غریب میں اتنی جان نہیں۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ اپنا تعلق خدا کی اس مخلوق سے بجائے نام رہ گیا ہو۔ حیوانِ ناطق و مطلق میں تمیز تو انسان ہر وقت کر سکتا ہے۔ لیکن ایسی حالت بھی ہوتی ہے۔ کہ تمیز کرنے کو جی نہیں اُٹھتا۔ آگے چل کر شاید اس سے بھی بڑھکر کوئی درجہ آتا ہو۔ بہرکیف بندروں کا ذکر پڑھ کر ناظرین کے دل پر اگر کچھ اثر ہو۔ تو انہیں مسٹر کپلنگ کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ مترجم سے کوئی شکایت نہ پیدا ہونی چاہیئے۔ اور جانوروں کا حال بھی مصنف نے کچھ ایسا دل میں دل ڈال کر لکھا ہے کہ اگر ان جانوروں میں بھی مصنف ہُوا کرتے۔ تو وہ بھی اس سے بہتر اپنا حال نہ لکھ سکتے ۔

اُونچی ڈال کو تاڑتے ہی مکھیوں کو دم جھانسے دے کر کسی پھلواڑی کا پتہ بتا دینا اور ان کے جاتے ہی چھتوں میں سے شہد نچوڑ چٹ کر جانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جلتی دوپہر اور چلچلاتی دھوپ میں پیڑوں پر چڑھ پتوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر سو جانا اور سونے کو جی نہ چاہا تو غریب چمگادڑ کو جگا کر ستانا روز کا مشغلہ تھا۔

"کہو بی دیدوں پھوٹی! آج تمہارا جی کیسا ہے؟ خیر سے اُلٹی کیوں لٹکی ہو؟ کوئی چٹ پٹی کہانی سناؤ۔ تو ہم بھی تمہارے ہی پاس اُلٹے لٹک رہیں۔"

چمگادڑ غریب جھنجلا کر کہتی "دُر موئے میری آنکھیں دکھتی ہیں" اور پھڑ پھڑ کرتی ڈال سے دو گز نیچے کہیں لٹک رہتی۔ اور زلفی اس زور سے ہنستا کہ ایک بیری کی چڑیاں جھڑ جھڑ کر کے دوسری بیری پر ایک سپاٹے میں پہنچ جاتیں۔ اور کچھ دیر غل مچا کر چپ ہو جاتیں۔

پانی میں اُترنے سے پہلے پانی کے سانپوں اور کیچوے کی جونکوں کو خبردار کرتا۔ کہ ہم آتے ہیں۔ اور مینڈکوں کو ڈانٹ بتاتا۔ کہ بڑوں کو دیکھ کر ٹر ٹر فوراً بند کرنی چاہیے۔

جب تک ان باتوں کو کوئی بتائے نہیں۔ بھلا آپ سے آپ کس

کو آسکتی ہیں؟ اور ان کے بے سیکھے جنگل میں کون ایک گھڑی جی سکتا ہے؟

اور پھر ان باسیوں کی نازک مزاجی کا حال کچھ جنگل والوں ہی سے پوچھئے۔ کہ جہاں کسی پردیسی جانور نے اچانک ان کی بستی میں قدم رکھا۔ اور یہ سمجھے کہ بس اب زندگی بے حلاوت ہوئی۔ سب ہی تو مل کر مسافر غریب پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یوں تو سبق سب ہی مشکل تھے۔ مگر اپنے دیس سے نکل کر پردیس میں بھوک کے وقت شکار کی صدا لگانی زلفی کو بہت دنوں میں یاد ہوئی۔

اوّل تو اپنا علاقہ چھوڑ کر دوسرے کی زمین میں جانا اور پھر غیروں سے شکار کی اجازت مانگنی۔ اور جب تک جواب نہ ملے۔ بھوکے بھیڑیوں کی لے میں صدا لگانی "بھوکے ہیں یارو۔ کرلیں شکار؟ عف عف عف"! سخت مشکل کام تھا۔ اگر کسی نے سن لیا تو میاں پردیسی کو شکار کی اجازت مل جاتی تھی۔ لیکن وہ کوئی بڑا سا شکار تاکتے تھے تو فوراً پہاڑ کی چوٹی یا چٹان کی کگر سے جنگل کا کوئی چودھری للکار اٹھتا۔ کہ خبردار بھوک سے زیادہ ڈیل ڈول کا شکار اس بن میں مارا۔ تو تم جانو گے! بھیڑیوں کے اخلاق پر تو بھلا کس کی مجال ہے۔ کہ منہ آئے۔ لیکن یہ آواز پہاڑوں اور جنگلوں میں ایسی گونجتی پھرتی تھی

تمک نوچ نوچ کر پیٹ بھر لیتے تھے۔ سوکھے چمڑے اور پرانی جوتیوں کا تو کیا ذکر ہے۔ غرض اِسی کھانے پینے کی بے احتیاطی نے اُن کو بھیڑیوں کی قوم میں جو ذات کے اُونچے اور گھرانے کے سب میں بڑے ہیں۔ سخت ذلیل و خوار کر دیا تھا۔ اور پھر اس خوش اخلاقی پر ایک طرہ یہ اَور تھا کہ کبھی کبھی پاگل ہوجاتے تھے۔ اور خدا وہ دِن نہ دِکھائے۔ کہ میاں طباقی کا دل اُلٹے۔ سارا جنگل نمونۂ محشر ہوجاتا ہے۔ پھر ان کو کس کا لحاظ۔ کس کی شرم۔ دُم سیدھی کئے جنگل میں دوڑے پھرتے ہیں۔ اور جو ملتا ہے اس کو کاٹ کھاتے ہیں۔ اور جو اپنا درجہ ہوتا ہے۔ وہ ہی دُوسرے کا درجہ کرتے ہیں۔ اس لئے جنگل والوں کو ان سے نفرت ہی نہیں ہے بلکہ جان کا بھی خوف رہتا ہے۔ کہ خُدا جانے کس وقت پاگل ہوجائیں۔ بھیڑیے شیر تک کا یہ حال ہے۔ کہ جہاں ان حضرت کی وارفتگی کا حال سُنا۔ اور ڈر کے مارے کہیں دبک کر بیٹھ رہے۔ سچ یہ ہے۔ کہ بن باسیوں میں دیوانگی سے بڑھ کر کوئی عیب نہیں۔ اور یہ عیب اگر ہے۔ تو میاں طباقی میں سب سے سوا ہے۔ ان ہی سے شروع ہے۔ اور ختم خُدا جانے کس کس پر ہوتا ہے ۞

سر میں یہ آپ کے مسائلِ صید و شکار اور یہ آپ کی ٹھائیں ٹھائیں کیونکر سما سکتی ہے! بے چارے کا سر تو دیکھئے کیسا چھوٹا ہے۔

بھالو - چھوٹے سر کو بڑا بنانا تو میرا کام نہیں ہے۔ جنگل میں کوئی چیز ایسی چھوٹی بتائیے جس کو گھر بیٹھے شکار کر کے گذارا کرنا آسان ہو۔ یہ تو جنگل ہے۔ اور جنگل بھی خونخواروں کا۔ جے پور کا عجائب گھر تو نہیں۔ کہ گھنٹی بجتے ہی چھلا چھلایا راتب کانٹے کی تول مل گیا اور کھاپی خس کی ٹٹی میں منہ ڈال سو رہے۔ میں تو خود اس کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ جب بالکل ہی جی نہیں لگاتا۔ تو آہستہ سے ایک آدھ چٹخنا لگا دیتا ہوں۔ وہ بھی بہت ہلکے ہاتھ سے۔

بگھیرا - اللہ رے آپ کے ہلکے ہاتھ۔ پھولوں کی چھڑیاں بھی بھاری ہوتی ہیں۔ اب کیوں بھرے مکتب میں لونڈوں کے سامنے فضیحت کراتے ہو۔ گرو جی خرانٹ! یہ آپ کے ہاتھ ہیں یا لکڑی کی کھڑاؤں میں لوہے کی میخیں جڑی ہیں! ان ہی ہلکے ہاتھوں نے تو غریب کا سارا منہ لہولہان کر دیا۔ اور آپ کے نزدیک گویا کوئی بات ہی نہیں واہ!

بھالو بگڑ کر بولے "منہ لہولہان کرنا کیسا۔ اگر ہم سر سے دُم تک خون کی بوٹی بنا دیں۔ تو بھی کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

آج کا لہولہان ہونا اچھا یا کل کو جاہل کندۂ ناتراش رہ کر جنگل کی خاک پھانکنی اچھی۔ کہنے کو تو ہو گئے۔ یہ نہ دیکھا۔ کہ کس طرح اس کے پیچھے اپنا خون پانی ایک کر رہا ہوں۔ جنگل کا ایک ایک منتر اس کو یاد کرایا ہے۔ اگر بھول نہ گیا۔ تو مجال ہے۔ کہ بھیڑیوں کو چھوڑ کر جنگل کا کوئی شکاری زمین کا چلنے والا ہو یا ہوا کا اُڑنے والا اس کو بُری آنکھ سے دیکھ سکے۔ جانوروں کے جس غول میں جائے گا فوراً اس کو پناہ دی جائے گی۔ پھر اگر اسی کی بھلائی کے لئے ایک آدھ طمانچہ لگا دیا۔ تو کون سے لعل جھڑ گئے؟

بگھیرا یہ تیز گفتگو سن کر جی میں شرمندہ سا ہو گیا۔ اور ہنسی میں ٹال کر بولا "گروجی قصور معاف ہو۔ تم گرو اور یہ لونڈے تمہارے چیلے۔ جس طرح چاہے سدھاؤ پڑھاؤ۔ پر ذرا اس کا خیال رہے کہ یہ غریب بچہ پیپل کی جڑ یا برگد کا ٹھنا نہیں ہے۔ جس پر کبھی آپ بھولے سے پنجے تیز کرنے لگیں۔ مر ہی کر تو رہ جائے گا۔ بے قدروں کی کون قدر کرے۔ ہم تو سدا کے جاہل اکھڑ ہیں۔ الف کے نام ڈھول اور بے کے نام دھپے کے سوا کچھ نہ آیا۔ مگر کان میں بات پڑی رہنی اچھی ہے۔ ذرا وہ مہامنتر ہم کو بھی تو سنوا دیجے۔ جو آپ نے اس چیلے کو سونپے ہیں؟ یہ تو ظاہر ہے۔ کہ ہم کو ان کا کیا

کام پڑ سکتا ہے جو اپاہجوں کے دستگیر ہوں وہ خود محتاج ہو کر دوسروں کے سامنے کیا ہاتھ پھیلائیں گے۔" اور اتنا کہہ بگھیرے نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا۔ اور سمٹے ہوئے پنجے کو پھیلا کر انگلیاں چھدری کر لیں۔ اور انگلیوں کے سرے پر اودے اودے فولاد کے سے ڈھلے ہوئے ناخنوں کو جو لوہار کی کنٹیاں یا سنگ تراش کی چھینیاں معلوم ہوتے تھے غور سے دیکھ کر بولا۔ "ان سے بڑھ کر جنگل کا کون سا منتر ہوگا لیکن ذرا اس بچہ کے منہ سے وہ منتر ضرور سنوائیے۔"

بھالو نے تکلف کے ساتھ گردن پھیر کر بہت اطمینان سے آواز دی۔ "زلفی زلفی! بیٹا! بس غصہ کو تھوک دو۔ اور ذرا ادھر چلے آؤ۔"

درخت پر سے کسی نے منہ چڑایا۔ اور آواز کی نقل اتاری "بلفی بلفی۔ ہاؤں ہاؤں۔ سر میں تو میرے اب تک تتے کاٹ رہے ہیں۔ اور انہوں نے پھر زلفی زلفی جپنا شروع کر دیا۔ اب کیا مجھے جان سے مارو گے؟" اور اس آواز کے آتے ہی ڈال پر سے کوئی چیز پھسلی۔ اور دھم سے زلفی زمین پر کودا۔ اور جدھر ریچھ بیٹھا تھا ادھر سے کترا کر بگھیرے کے پاس چلا آیا۔ اور کہنے لگا۔ "میں تو اپنے بگھیرے کے پاس آیا ہوں۔ کوئی تمہارے پاس

نہیں آیا۔ بھالو جی موٹے! بھالو جی موٹے!!

ریچھ اپنے جی میں کڑھ کر بولا "ان کے پاس آئے یا میرے پاس۔ بات ایک ہی ہے۔ اچھا جب جانیں کہ آج کا سبق فرفر سُنا جاؤ"؟

زلفی۔ اچھا تو کس جانور کا منتر سُنئے گا۔ جنگل کے تو بیسیوں منتر ہیں۔ وہ پوچھئے جو نہ آتا ہو؟

بھالو۔ واہ وا۔ شاباش۔ دو چار ہی باتیں سیکھ کر ایسے پھولے؟ سُنتا ہے یار بگھیرے۔ اس زمانہ میں اُستاد کی کیا قدر ہوتی ہے؟ اور ایسے محسن کا احسان کیونکر مانا جاتا ہے؟ اسی جنگل میں لونڈے پڑھاتے عمر گذر گئی۔ مگر آج تک کسی بھیڑیئے کے لڑکے کو آنی توفیق نہ ہوئی۔ کہ مکتب چھوڑے پیچھے پھر کبھی اُستاد کے سلام کو آتا۔ اچھا دانشمند ذرا درندے شکاریوں کا منتر تو سُناؤ۔ بڑے لائق بنے پھرتے ہو۔

زلفی کو سبق تو یاد ہی تھا۔ بہت خوش ہو کر اُستاد کے لہجے میں زور زور سے دھاڑنے لگا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا۔

جو خُوں خوار ہو تم۔ تو خُوں خوار ہیں ہم۔
کسی بات میں تُم سے ہرگز نہیں کم۔
ہمارا تمہارا ہے خُوں ایک یارو۔

بولا۔ دور ہو موذی۔ جس کا غلام ہے اسی کی خوشامد کر۔ آج کے شکار کا تو ناس کھو دیا۔ اور کیا چاہتا ہے؟"

اتنا سنتے ہی میاں طباقی ایک چھلانگ میں جھٹ سے باہر آئے۔ اور یہ کہتے ہوئے نوک دم بھاگے۔ "بہت خوب۔ بہت خوب۔ بندہ رخصت۔ خود ہی سن لیجئے۔ وہ ندی کے کنارے جھاڑیوں میں شیر خاں آپہنچے"

بھیڑیئے نے جھٹ دونوں کان اونچے کر لئے۔ اور غور سے سننا شروع کیا۔ پہاڑ کے نیچے جہاں گھاٹی میں ندی بہتی تھی غرانے کی آواز آئی۔ آواز میں ایسی گرج تھی۔ جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ حالت بہت غیظ و غضب کی ہے۔ اور اس بات کی مطلق پروا نہیں کہ کوئی سنتا ہے یا نہیں۔ بھیڑیا اتنا سنتے ہی گھر والی سے کہنے لگا۔ "سنتی ہو اس احمق کو۔ شروع رات کا تو شکار ہے۔ اور آواز میں کس بلا کی تیزی ہے۔ بے وقوف سمجھتا ہے۔ کہ ہمارے جنگل کے ہرن اور پاڑے بھی بان گنگا کی مریل گائیں ہیں۔ آنکھوں کی اندھی اور کانوں کی بہری۔ جن کو سوائے چرنے کے کسی بات کا ہوش نہیں"

بھیڑیئے کی بیوی بولی "واہ آپ بھی خوب سمجھے۔ کس کا ہرن

باتیں تو مار کھانے کی ہیں۔ ارے بے وقوف سینڈک! جب سمجھ آئیگی تو یاد کرے گا۔ کہ ہاں بھالو بھی کوئی تیرا بڑا بوڑھا تھا "۔

یہ کہہ کر ریچھ بگھیرے سے باتیں کرنے لگا۔ اِدھر اُدھر کی گپ شپ اور جنگل کی خیر خبر کے بعد بولا "یہ منتر جو آپ نے ابھی ابھی اس لڑکے کی زبان سے سُنے نہایت مشکل سے دستیاب ہوئے ہیں۔ گجپال ہاتھی کی توجہ سے جو اکثر مست رہتے ہیں۔ اور تن پہ بھبھوت ملے کھیتوں میں گنے کھایا کرتے ہیں۔ یہ علم مجھ تک پہنچا۔ بلکہ اُنھوں نے تو یہاں تک تکلیف گوارا کی۔ کہ ایک دن زلفی کو کندھے پر چڑھا کر سرپ جھیل تک لے گئے۔ اور وہاں اپنے پُرانے دوست بل ناگ سے اس کو سانپ کا منتر یاد کرا کر لائے۔ میرا حال تو آپ جانتے ہی ہیں۔ کہ نہ گلا پایا ہے نہ گلپھڑے۔ پُھنکاروں تو کیونکر پُھنکاروں! اور جب کوئی چیز خود نہ آتی ہو۔ تو دوسرے کو کیا سکھائی جائے! غرض آپ کی توجہ سے اب یہ قہرن کا لاڈلا اتنا ہو گیا ہے۔ کہ جنگل کا کوئی اصیل جانور خواہ درندہ ہو یا پرندہ۔ چرنے والا ہو۔ یا رینگنے والا۔ اس کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔ اور اب یہ لڑکا صحرا کے سب کھٹکوں سے بے جوکھ ہے "۔

بگھیرا۔ یُوں فرمائیے۔ کہ بھیڑیوں کی برادری کے سوا جنگل

کے اور خطروں سے محفوظ ہے۔ کیوں بھیا زلفی۔ تم بھی کچھ سمجھتے ہو؟
رہے ارے پسلیاں کیوں توڑے ڈالتا ہے۔ بیٹھا ہے تو نچلا بیٹھ
اچھنے کیوں لگا؟

جنگل کی اچھوت جاتی

بڑوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ زلفی کو بھی بیچ میں بولنا ضرور تھا۔ کبھی بگھیرے کی گردن میں ہاتھ ڈال کر شانہ کی کھال کھینچتا کبھی زور زور سے لاتیں مار کر چیختا۔ یہاں تک کہ بات کرنی دشوار کر دی۔ ناچار بھالو نے کہا۔ "اچھا کہو کیا کہتے ہو؟"

زلفی چہک کر بولا۔ "گرو جی۔ آپ کو کچھ خبر بھی ہے۔ ہم کہاں گئے تھے؟ ابھی ابھی جب درخت پر چڑھے تھے۔ ہم نے تو اب پیڑ والوں سے یارانہ گانٹھا ہے۔ ایک بڑی ساری فوج تیار کی ہے۔ جنگل میں خوب ڈاکے ڈالیں گے۔ وہ ہماری فوج ہو گی اور ہم اس کے سردار۔"

بگھیرے نے گھرک کر کہا۔ "ارے بے وقوف۔ یہ کیا بکتا ہے۔ چپ رہ۔"

زلفی۔ ہاں ہاں۔ جب لڑنے بھڑنے سے چھٹی ملے گی۔ تو

پیڑوں پہ بیٹھ کر گرو جی کی چندیا پہ خوب کوڑا کرکٹ پھینکا کریں گے
مجھ سے اُن سے خوب پکا قرار ہو گیا ہے۔ گرو جی سمجھے"؟

بھالو نے بھوں بھوں کر کے اُلٹے ہاتھ کا کفچہ زلفی کے جڑا۔ اور زلفی گرتے ہی لڑکنیاں کھا بگھیرے کے اگلے دونوں پاؤں کے بیچ میں لیٹے لیٹے کن انکھیوں سے دیکھنے لگا۔ کہ بھالو جی تو سچ مچ خفا ہو گئے ۔

بھالو کو حقیقت میں غصہ آ گیا تھا۔ کہنے لگا "زلفی میں تیرا مطلب سمجھا۔ نابکار تُو نے بندروں سے دوستی کی ہے۔ اور ان ہی کے پاس تُو گیا تھا۔ ہم تو یوں رات دن تیری سیوا کریں۔ اور تو یہ کرتوت سیکھے۔ اب بتا تیری کیا سزا ہے"؟

زلفی نے بھالو کی طرف سے نظر ہٹا کر بگھیرے کی صورت دیکھی کہ کہیں بھالو کی طرح یہ بھی تو خفا نہیں ہو گئے۔ لیکن بگھیرے کی آنکھوں سے کچھ پتہ نہ چلا ۔

بھالو غصے میں تو بھرے بیٹھے ہی تھے۔ زلفی کو پھر ڈانٹنا شروع کیا "میرا شاگرد ہو اور بندروں میں بیٹھے۔ اور بندر بھی بھورے بندر۔ لال مُنہ والے۔ جن کا نہ کوئی والی ہے نہ وارث جن میں کھانے کی احتیاط ہے نہ پینے کی۔ شرم شرم !!

زلفی - اچھا تو پھر آپ نے مجھے مارا کیوں تھا؟ میں بھی رُوٹھکر نکل گیا۔ تھوڑی دُور گیا تھا۔ کہ پیڑوں پر سے بہت سے بندر دھم دھم کرکے کُود پڑے۔ اور میرے پاس آتے ہی سب مجھ پر ترس کھانے لگے۔ آپ کو مجھ پر ترس آتا۔ تو بندر میرے پاس کیوں آتے؟

اتنا کہتے ہی زلفی اُلٹی ہتیلی سے ناک رگڑنے لگا۔ خدا معلوم اُستاد کی خفگی کا اثر تھا۔ یا کوئی مکھی لات مار کر اُڑ گئی تھی۔

بھالو - ارے احمق! بندر اور کسی پر ترس کھائیں؟ جیٹھ بیساکھ کا سُورج ٹھنڈا پڑ جائے سچ۔ پہاڑ سے رَوا اُترے اور شور نہ ہو سچ۔ پر بندروں کو کسی پر ترس آئے جھوٹ۔ اور سَو کا ایک جھوٹ آگے تو بتا کیا ہوا؟

زلفی - پھر مجھے بھوکا دیکھ کر وہ جلدی جلدی گئے۔ اور بہت سارے کچے پکے پھل کلّوں میں بھر کر میرے پاس لائے۔ اور ڈنڈا ڈولی کرکے مجھے درختوں پر چڑھا لے گئے۔ اور ڈال ڈال پات پات کی سیر کرائی۔ اور میری صورت خوب غور سے دیکھ کر بولے۔ "اوہو۔ تم تو ہمارے بڑے پُرانے یار ہو۔ یار کیسے بلکہ بھائی ہو۔ اتنے دن سے کہاں تھے؟ اچھا۔ اور یہ کیا! دُم کہاں چھوڑ آئے؟

ادھر دیکھو وہ جہاں ہری ہری ٹہنیاں ٹوٹی ہیں۔ دو تین پاس پاس بیٹھے دیدے مٹکا رہے ہیں۔ اچھے میرے بھالو۔ اس پیڑ پر چڑھ جاؤں ابھی کھیل کر چلا آؤں گا۔

بھالو بہت جھلا کر بولے "آدمی کے بچے سُن لے"۔ اور بھالو کی آواز ایسی ڈراؤنی تھی جیسے گرمی کی رات میں پچھلے پہر سے آندھی کا بادل گرجتا ہو۔ "سُن لے میں نے تجھ کو جنگل کی پوتھی سے بن کی بدیا سکھائی۔ اور تمام بن باسیوں کے بڑے بڑے منتر یاد کرائے۔ کہ کسی موذی جانور سے تجھ کو اذیت نہ پہنچے۔ بندروں کا کوئی منتر نہیں ہے۔ ان کے خفقان کی دوا لقمان کو بھی یاد نہ تھی۔ وہ پیڑوں کے رہنے والے ہیں۔ ان کے ہاں کسی قانون کا رواج نہیں۔ جات برادری سے باہر ہیں۔ کوئی ان کی بولی نہیں ہے۔ جو بات جس کے مُنہ سے سُنی۔ اسی کی نقل اُتارنے لگے۔ چور ہیں۔ اُچکے ہیں۔ اُٹھائی گیرے ہیں۔ درختوں میں چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور پتوں کی اوٹ سے جنگل والوں کو تاکتے جھانکتے رہتے ہیں۔ ان کا طریق ہمارا طریق نہیں۔ ان کا کوئی ہادی و رہنما نہیں۔ کوئی بات ان کو کبھی یاد نہیں رہتی۔ رات دن ڈینگیں مارتے اور گپیں ہانکتے ہیں۔ خوب شیخیاں مار بگھار کر خیالی پلاؤ پکاتے ہیں۔ جنگل میں اپنی قوم سے بڑھ کر

کوئی جوہڑ ملے تو ڈوب مریں۔ مگر بے غیرتوں کو موت کہاں
تھوڑی دُور دوڑنے کے بعد سب کچھ بھول گئے۔ اور آدھی ر
ابھی ایک نہ بجا تھا۔ کہ اور بھائی بندوں کے ساتھ بن کی چوکید
کرنے لگے۔

اب سُنئے۔ کہ جب شیر بھٹ سے چلا گیا۔ تو بی تھرن اپنے
بچوں میں آن پڑیں۔ جنہوں نے رو رو کر سارے بھٹ کو س
اُٹھا لیا تھا۔ آخر عورت ذات تھیں۔ دم قابو میں نہ رہا۔ ناتوا
سے ہانپنے لگیں۔ اور دیر تک چُپ بیٹھی غصّے کو دھیما کیا رکیں
دیر تک میاں بیوی خاموش بیٹھے رہے۔ آخر کو بھیڑیا بو
"ایک بات شیر خاں نے ذرا ٹیڑھی کہی ہے۔ ذرا خوب سو
سمجھ لو۔ اگر اس بچے کو اپنے ہاں رکھتی ہو۔ تو ایک دن پنچو
کے سامنے اسے لے جانا ہوگا۔ یا بالکل جی میں ٹھان لی۔
کہ اس کو پالو گی۔ ہم تو جانیں کھاپی کر فیصلہ بھی کر دو۔ کیو
بات بڑھاؤ۔ کسی کو خبر تک نہ ہوگی"۔

تھرن بگڑ کر بولیں "مجھے یہ بے وقت کی ہنسی بھلی نہیں
لگتی۔ آخر تمہارے مُنہ پر بھی تو دیدے ہیں۔ اتنا نہیں سوجھتا
کہ یہ نگوڑا ذرا سی جان اوّل تو گرتا پڑتا اپنے آپ ہمارے

کوئی دلی تمنا ہے۔ تو بس یہ ہے۔ کہ جنگل والے ان کو دیکھیں اور سمجھنے لگیں۔ کہ یہ بھی کچھ ہیں، لیکن ہمارا طریق یہ ہے۔ اور یہ ہی طریق سب سے بہتر ہے۔ کہ ہم ان کی مطلق پروا نہیں کرتے، اتنا بھی نہیں جانتے کہ وُہ کدھر بستے ہیں۔ پیڑوں پر سے کُوڑا کرکٹ پھینکنا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر وہ رات بھر ہمارے سروں پر نجاست بھی پھینکتے رہیں۔ تو بھی ہمارے بھاویں نہیں"۔

بھالو ابھی پوری بات کہنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ املی پر سے کتاروں کی بوچھاڑ آئی۔ اور ایک دفعہ ہی آس پاس کے درختوں سے کھلنسنے کھنکارنے اور گلا صاف کرنے کا وُہ غل مچا۔ کہ سب پریشان ہو گئے۔ اور ابھی یہ طوفانِ بے تمیزی کم نہ ہوُا تھا۔ کہ پیڑوں میں بندروں کا بھونچال آیا۔ تو ڈال ڈال تو میں پات پات۔ ایک ایک بندر نے چقندر کی طرح مُنہ لال کر کے اس غضب کی دھمال شروع کی۔ کہ درختوں کی ڈالیں زمین پہ جُھک جُھک کر چوٹیوں کو سلام کرنے لگیں۔ بھالو بیٹھے سے اُٹھ کھڑا ہوُا۔ اور بگھیرا بھی دُم ہلانے لگا۔

بھالو نے زُلفی کو جھنجوڑ کر کہا۔" بس دیکھ لے اور سُن لے اور سمجھ لے۔ اور کبھی نہ بھولنا۔ کہ جنگل کے شریف شکاریوں پر بندر

حرام کئے گئے ہیں۔ اگر اب کبھی پھر ایسی حرکت کی۔ تو پنجوں سے کھال کھینچ کر دھوپ میں سوکھنے ڈال دوں گا۔

بگھیرا۔ ہاں بھیا۔ پھر ایسی حرکت نہ کرنا۔ بات تو جب تھی۔ کہ اُستاد پہلے ہی سے شاگرد کو ہوشیار کر دیتے۔ اور یہ نوبت ہی نہ آتی۔

بھالو۔ مجھے خبر تھی۔ کہ یہ آپ کے لاڈلے درختوں کو نشین بنا کر بندروں کی صحبت اختیار کریں گے۔ اور بندر بھی بھورے بندر توبہ توبہ کس کا نام لیا۔

بھالو چپ نہ ہوئے تھے۔ کہ درختوں پر سے کوڑے کرکٹ سوکھے پتوں اور سوکھی ٹہنیوں کا ایک چھتراؤ اور آ گیا۔ اب تو بھالو جھرجھری لے پوستین جھاڑ کھڑے ہو گئے۔ اور بگھیرے کو اشارہ کر زلفی کو ساتھ لے درختوں کے نیچے سے نکل میدان کے رستے پڑ لئے۔

بندروں کا چودھری

رکھ نے بندروں کے احوال میں جو کچھ گفتگو کی تھی۔ وہ بے جا نہ تھی۔ بندر درختوں کے رہنے والے ہیں۔ اور درندوں

کی عادت ہے۔ کہ منہ اُٹھا کر بہت کم اُوپر دیکھتے ہیں + اس لئے
نہ یہ اُن کا رستہ کاٹتے تھے نہ وُہ ان کا۔ لیکن بندروں میں
خود نمائی کا شوق اِس قدر بڑھا ہوُا تھا۔ کہ راہ چلتے شکاریوں کو
چھیڑتے + اگر بیمار بھیڑیا۔ تھکا ہارا ریچھ یا زخمی تیندوا زمین پر
پڑا اَل جاتا۔ تو پھر وہاں سے نہ ٹلتے۔ جھٹ جھپٹ کر آتے اور
مٹھیاں چوُم چوُم بیمار کو لاتک دُوسری طرف کو دجاتے۔ اور پھر زخمیو
کے سرہانے ناچ رنگ کی محفلیں جما دیتے۔ اور ایسے بے سُرے
گیت گا گا کر اور دُھر پتیں الاپ کر غل مچاتے۔ کہ کوئی نہ مرتا
ہو تو مرجائے +

پیڑوں پر چڑھ کر رہ گیروں پر آوازے کستے۔ کہ اُوپر آؤ
تو بتائیں۔ اس پر کوئی مُنہ نہ لگاتا تو کسی آم کی گٹھلی اور امرُود
کے چھلکے ہی پر لڑائیاں ٹھن جاتیں۔ اور ٹولیاں بنا کر کُشت و
خون میں مصروف ہوجاتے۔ اور اپنے مُردوں کو بے گور و کفن
درختوں کے نیچے پڑا چھوڑ جاتے۔ کہ جنگل والوں کی نظر پڑے
اور وہ ان ناپاک مُردوں کو سُونگھ سُونگھ کر زبان سے ناک چاٹتے
ہوئے بھاگ جائیں +

مگر باوجود ان زیادتیوں کے کوئی کان تک نہ ہلاتا تھا۔

اور پنچایتیں ہوا کرتی تھیں۔ کہ کسی بڑے بوڑھے بندر کو چودھری بنایا جائے۔ قانون و آئین جاری ہوں۔ نظم و نسق کا سلسلہ قائم ہو۔ جس پر سارا جنگل عش عش کرے ۔

لیکن کبھی یہ منصوبے پورے نہ ہوتے تھے۔ آج کی بات کل کو یاد رکھتے تو سب کچھ ہوتا۔ اگر کسی کو کچھ خیال بھی رہا تو بزرگوں کی یہ مثل یاد کر کے کہ "جو آج بچاریں بندر وہ کل بچاریں بھالو" دل کو تسلی دے لیتے تھے ۔

غرض ہر بات میں تقدیم و ایجاد کا شرف بندروں ہی کو حاصل رہتا تھا۔ درندوں کی پہنچ سے باہر تھے۔ اور باہر کیوں نہ ہوتے جس صورت میں بندر کا ذکر کرنا تو کیسا بندر کا خیال تک ذہن میں لانا باعث شرم سمجھا گیا ہو۔ تو پھر صحرا کا وہ کون سا شکاری تھا جو اُن کی مزاج پرسی کی ترکیب نکال کر اس رسوائی کو اپنے سر لیتا ۔

اور یہی وجہ تھی۔ کہ جب زُلفی بندروں میں کچھ دیر کھیل کر بھالو کے پاس گیا۔ اور بھالو اس پر خفا ہوا۔ تو یہ بندر دل میں بہت خوش ہوئے۔ کہ خیال کرنا کیسا۔ آج تو ہمارے قصے بڑوں کی زبان پر ہیں۔ اور بجز اس کے کہ ادنے باتیں اور خفیف

والیاں بھی یہی آواز لگاتی تھیں۔ اور سارا جنگل گونج اُٹھتا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر میں پھر وہ ہی پہلا سناٹا ہو جاتا تھا۔

اور اب وہ وقت آیا۔ کہ آدمی کا بچہ بھری پنچایت کے سامنے پیش ہو۔ قہرن کی گردن پھول کر گپھا ہو گئی۔ اور چندیا کے بال کھڑے ہو کر سوئیوں کی طرح چمکنے لگے۔ بھیڑیئے نے اُٹھ کر زُلفی کی ٹانگ پکڑی۔ اور اس کو حلقے کے بیچوں بیچ لا کر بٹھا دیا۔ (ہم شاید یہ لکھنا بھول گئے ہیں۔ کہ بھیڑیئے کی بیوی نے اس بچے کا نام زُلفی رکھا تھا۔ اور پیار سے میگھا بھی کہا کرتی تھیں کیونکہ ان کو آدمی کے بچے کی صورت مینڈک سے بہت ملتی جلتی معلوم ہوتی تھی) بچہ پہلے تو کچھ بسورا۔ مگر پھر چاندنی میں چمکتی کنکریوں کو دیکھ کر خوش ہو کر ان سے کھیلنے لگا۔

چودھری نے پنجوں پر سے سر تک نہ اُٹھایا۔ اور اسی گھرگھراتی آواز سے پکارتا رہا "بھیڑیو بھیڑیو۔ دیکھ لو۔ بھال لو۔ دستور کو نہ بھولو" اتنے میں چٹانوں کے پیچھے سے شیر خاں کی آواز اُترتی گھٹا کے بادل کی طرح گرجی۔ اور ہوا کے جھونکے کے ساتھ بھیڑیوں نے سُنا۔ کہ "اے بھیڑیوں کے سردارو! یہ بچہ ہمارا شکار ہے۔ اور ہم کو ملنا چاہیئے۔ بھیڑیوں کی آزاد قوم کو آدم زاد سے کیا واسطہ!"

اثر تھا۔ کہ زُلفی آپ سے آپ ہری ٹہنیوں کو بُن کر چھوٹی چھوٹی ٹٹیاں بنا لیتا۔ اور جب جاڑے میں ہوا تیز چلتی۔ تو یہ غریب چھ برس کی جان کسی درخت کی آڑ میں ان ٹٹیوں کی چھوٹی سی جھونپڑی ڈال کر لیٹ رہتا ۔

کہیں ان کم بخت بندروں نے بھی اس کو یہ کھیل کھیلتے دیکھ لیا تھا۔ اور اب اس بندر کی بات سنتے ہی سب کے سب دل میں سوچنے لگے ۔ کہ آندھی۔ مینہ ۔ جاڑے۔ پالے اور اولوں کے طوفان سے بچنے کے لئے واقعی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں۔ کہ زلفی کو پکڑ لے چلیں اور برسات سے پہلے پہلے پیڑوں پیڑوں چھاؤنیاں چھوڑ دیں ۔

اب تو بندروں کو پورا یقین ہو گیا۔ کہ ہیں آج ہماری قوم کا سردار بہ اجلاس کامل منتخب ہو گیا۔ اور کوئی دن جاتا ہے۔ کہ ہم جنگل میں سب سے بڑھ کر لائق ہو جائینگے ۔ اور ہماری لیاقت کا شہرہ ایسا عام ہو گا۔ کہ جنگل کے جتنے شکاری ہیں۔ سب ہی تو چندیا کے بل قلا بازیاں کھاتے ہوئے دُور دُور سے ہمارے دربار میں حاضر ہوں گے۔ اور کمر سے دُمیں کھول کر اپنا سر ہمارے قدموں میں ڈال دینگے ۔

غرض جب تھوڑی سی قیل قال اور بہت سی نوچ کھسوٹ کے بعد یہ مسئلہ قطعی طور پر طے ہو گیا۔ کہ زلفی کو گرفتار کر لینا چاہئے۔ تو

"اس بچے کا جو حمائتی ہو۔ وہ کھڑا ہو۔ اور اپنی رائے ظاہر کرے"۔

جب کسی نے جواب نہ دیا۔ تو سوال پھر پڑھا۔ اس پر بھی جب کسی کی طرف سے کوئی صدا بلند نہ ہوئی۔ تو قہرن ہلکی سی چھری لے جان کھونے کو مستعد ہو گئی۔ اور دل میں سوچ لیا۔ کہ آج کا مقابلہ بچے پالنے کی مصیبت سے ہمیشہ کو آزاد کر دے گا۔ پھر نہ اپنا جی ہو گا نہ یہ عذاب۔

اب سنئے کہ بھیڑیوں کی پنچایت میں کسی غیر قوم کے جانور کو شریک ہونے یا گفتگو کرنے کا اختیار نہ تھا۔ مگر بھالو جی جمورے جو ایک بڑے کاہل وجود بھوری رنگت کے ریچھ تھے۔ اور بھیڑیوں کے بچوں کو بن کی پوتھی پڑھایا کرتے تھے۔ اس قاعدہ سے مستثنیٰ تھے۔ چونکہ صرف میووں اور شہد پر ان کا گذران تھا۔ اس لئے سب لوگ عزت کی نگاہ سے ان کو دیکھتے تھے۔ اور ان کی نقل و حرکت پر کوئی بھیڑیا معترض نہ ہو سکتا تھا۔ غرض جب دو دفعہ سوال پڑھا گیا۔ اور کسی نے جواب نہ دیا۔ تو ایک چٹان کے پیچھے سے بھالو جی یہ کہتے ہوئے نکلے "پنچو پنچو! ہماری بھی سن لو۔ ہم سیدھی اور سچی بات کے کہنے والے ہیں۔ جو کہیں وہ مان لو۔ اس آدمی

کے بچے کو غول میں شریک کرنے میں کچھ قباحت نہیں ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت کے ہم ذمہ دار ہوتے ہیں۔ بس ہماری اتنی سفارش کافی ہے۔"

یہ سن کر چودھری چٹان پر سے بولا "بھائیو سنتے ہو۔ بھالو ہمارے بچوں کا گرو اور ہمارا بڑا ہے۔ سچی بات جو تھی وہ اس نے کہہ دی۔ اب ایک بھائی کوئی اور اٹھے۔ اور گرو کی ہاں میں ہاں ملائے۔ تو اس بچے کا جی بچ جائے"۔

اتنا کہنا تھا۔ کہ ایک کالی کالی چمکتی پرچھائیں حلقے کے بیچوں بیچ دکھائی دی۔ اور بھیڑیوں میں غل پڑا۔ کہ بگھیرا آن پہنچا دُم کی نوک اور ناک کی پھننگ تک بالکل سیاہ جیسے اندھیری رات۔ سیاہ مخمل کی پوستین پر دھوپ چھاؤں کے گل بوٹے کالی اطلس کی سی جھلک دکھاتے تھے۔ اس وقت جتنے بھیڑیے موجود تھے وہ بگھیرے کو خوب جانتے تھے۔ کیونکہ یہ وہ بزرگ تھے جن کو رستے میں ٹوکنا کسی بھیڑیے کے لئے آسان کام نہ تھا۔ ذہانت فطانت میں طباقی کے کان کاٹتے تھے۔ ہمت و مردانگی میں جنگلی بجار کے چچا تھے۔ اور جب بگڑ بیٹھتے تھے۔ تو مست ہاتھی کی بھی کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ مگر زبان کے بہت میٹھے تھے۔ آواز

نازک اور شیریں تھی جیسے درخت کے پتوں پر شہد کی بوندیں ٹپکتی ہوں۔ اور جلد ایسی نرم تھی جیسے ریشم کے لچھے ؀

جلسے میں قدم رکھتے ہی غرائے۔ کہ "اے قوم کے سردار اور سیونی کے آزاد بھیڑیو! گو مجھ کو اس مجمع میں گفتگو کرنے کا حق نہیں۔ لیکن چونکہ ایک بڑے اصولِ قانون کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس لئے محض یہ کہنا ہے۔ کہ کسی مسئلہ قانون پر جو متعلق خونریزی کسی بچۂ شیر خوار کے ہو۔ اگر کوئی قطعی رائے قائم نہ ہو سکے۔ تو ایک معقول معاوضہ قبول ہونے کے بعد اس بچے کی جان کو سلامتی دی جا سکتی ہے۔ اور قانون نے کہیں تخصیص نہیں کی ہے۔ کہ اس معاوضہ کا پیش کرنے والا کون ہو۔ اب اہلِ جلسہ فرمائیں کہ جو کچھ عرض کیا۔ وہ واجب ہے یا غیر واجب؟"

بہت سے بھوکے بھیڑیئے جن کے پیٹ میں ہمیشہ آگ لگی رہتی ہے۔ بول اٹھے۔ "بے شک آپ کا فرمانا بالکل بجا و درست ہے۔ بھائیو۔ سن لو۔ پیٹ کی آنچ بری ہوتی ہے۔ اگر کچھ کھانے کو ملے۔ تو اس بچے کی جان سلامت چھوڑ دو۔ جنگل کا یہی دستور ہے۔"

بگھیرا۔ اچھا تو یہاں تک آپ نے میری بات کو تسلیم کیا۔

تھا۔ جیسے کوئی ملاح جہاز کے مستول پر چڑھ کر کوسوں تک سمندر کی موجوں کو دیکھتا ہو۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پتوں میں اس کا منہ چھپ جاتا۔ اور آناً فاناً میں بندر اس بلندی سے اُتر کر نشیب میں پہنچ جاتے۔ کہ پھر زقند لگا کر دوسرے پیڑ کی چوٹی پر اُڑ جائیں۔ غرض اسی طرح پیڑوں پیڑوں بھاگتا دوڑتا جست پر جست اور زقند پر زقند لگاتا یہ شیطانی لشکر زلفی کو نہ جانے کہاں کا کہاں لے پہنچا ۔

کئی دفعہ زلفی ڈرا۔ کہ بندر مجھے زمین پر پھینک دیں گے۔ اور ایک دفعہ تو وہ اسی خوف سے کچھ کسمسایا بھی۔ لیکن لڑکا ہوشیار تھا۔ فوراً سنبھل گیا۔ اور اسی طرح چپ چاپ تن و تقدیر دونوں کو بندروں کے حوالے کر اس مصیبت سے رہائی کی تدبیریں سوچنے لگا ۔

پہلی بات یہ سمجھ میں آئی۔ کہ کسی طرح بھالو اور بگھیرے کو اپنے حال سے خبردار کرے۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا۔ کہ جس تیزی سے بندروں کا قافلہ اس وقت جا رہا ہے۔ اس حساب سے اس کے دوست بہت پیچھے رہ گئے ہوں گے۔ اس اُمید میں کہ بھالو کہیں دکھائی دے گا۔ زمین کی طرف دیکھنے کی کوشش فضول تھی۔ کیونکہ نیچے جس

لگا۔ جو ایک قوم کے سردار کو ایک نہ ایک دن پیش آتا ہے یعنی وہ وقت جب کہ قوت زائل ہوتے ہوتے شکار مارنے کی طاقت نہیں رہتی۔ اور سب بھیڑیئے مل کر سردار کو ہلاک کر دیتے ہیں تاکہ اُس کا جانشین بنائیں۔ اور جب اس کا وقت آئے۔ تو اس کو بھی پھاڑ کھائیں۔ چودھری جب اس فکر سے کسی قدر ہوشیار ہوا۔ تو بھیڑیئے اور اُس کی بیوی سے کہنے لگا۔" اچھا اب خدا حافظ۔ جاؤ اور اس بچّے کو اچھی طرح تعلیم و تربیت کر کے جنگل کا سورما بناؤ "۔

غرض اس طرح ہمارا پیارا زُلفی بھالو جی کی سفارش اور بگھیرے کی ضیافت سے سیونی کے بھیڑیوں کا بھائی برادر بن گیا۔

زُلفی کا لڑکپن

اب ہم کو دس بارہ برس آگے بڑھ جانا چاہیئے۔ کیونکہ اگر اس زمانہ کے حالات یہاں لکھیں گے تو قصّہ طُول پکڑ جائے گا۔ صرف اس قدر لکھنا کافی ہے۔ کہ اس عرصے میں زلفی کی پرورش بھیڑیئے کے بچّوں کے ساتھ ہوتی رہی۔ یہ بچّے تو جلدی جوان ہو کر بڑے شکاری بھیڑیئے ہو گئے۔ لیکن ہمارا زلفی بچّہ یا یہ کہو

دیکھا تو یہ دیکھا۔ کہ بندر ایک نئی صُورت کے جانور کو اُٹھا کر بھاگے ہیں۔ فوراً زفیل دے کر جنگل کو ہوشیار کرنا چاہا۔ کہ اتنے میں زلفی نے پنچھیوں کا منتر پڑھ پھونکا۔ چیل متوجہ ہوئی۔ کہ کچھ اَور کہے تو سُنوں۔ مگر اس عرصہ میں درختوں نے زلفی کے مُنہ پر پردہ ڈال دیا چیل بھی شہباز کی خالہ تھیں۔ بازو کے ایک اشارے میں رُخ بدل درختوں کے اوپر اوپر اسی رستے پڑ لیں۔ جس رستے بندروں کا گارد قیدی کو لئے جاتا تھا۔

اتنے میں پتّوں کی اوٹ سے زلفی کا مُنہ نکلا۔ اور اُس نے پکار کر کہا "چیل! اچھی چیل! اُونچی چیل! تیری آنکھوں میں کاجل۔ میرا کھوج لیتی جا۔ پربت کے بگھیرے اور سیونی کے بھالو کو میرا حال جا سُنا"۔

چیل نے پُوچھا "کس کی طرف سے بٹیا۔ کس کی طرف سے؟" چیل نے زلفی کا حال تو سُنا تھا۔ مگر صورت نہیں دیکھی تھی۔

زلفی نے جواب دیا "میری طرف سے۔ میری طرف سے۔ زلفی میرا نام ہے۔ پیار سے مینڈک بھی کہتے ہیں اور بچۂ آدم کے نام سے جنگل میں مشہور ہوں۔ چیل۔ اچھی چیل۔ پیاری چیل۔ تیرے گھر میں پارس۔ میرا کھوج لیتی جا ...... لیتی جا ......

.... بچاؤ *

یہ آواز چیل کے کانوں تک اڑتی سی پہنچی۔ کیونکہ بندر ایک چوٹی سے دوسری چوٹی کی طرف اُڑ چکے تھے۔ لیکن چیل مطلب سمجھ گئی۔ اور جب دُم کی پتوار موڑ بازو مارتی ہوئی حلقہ باندھ ایسی اُونچی اُڑی کہ دیکھتے ہی دیکھتے تارا ہو گئی۔ اور جب اس بلندی پر پہنچ گئی تو کچھ دیر قیام کیا۔ اور دونوں آنکھوں کی دُوربین لگا کر دیکھنے لگی۔ کہ درختوں کی شاخیں کس طرح ایک ہی سمت میں جھومتی چلی جاتی ہیں۔ اور دل میں کہنے لگی "یقینی یہ ہی کھوج ہے اُن لٹیروں کا جو زلفی کو لے کر بھاگے ہیں"۔

کچھ دیر کے بعد دیکھا۔ تو درختوں میں حرکت نہیں رہی تھی۔ جی میں ہنس کر بولی "ارے واہ رے میرے پَر کے بھگوڑو! تمہاری بھی وُہی مثل ہے۔ کہ نو دن میں چلیں اڑھائی کوس۔ بڑی منزل ماری تو دس پانچ کوس چل کر کندھا ڈال دیا۔ کام دن بھر میں سو بچارو نبڑے ایک نہیں۔ اب تو وُہ جوانی کی نظر کہاں رہی۔ پر ہماری منقار پر بھی دیدے ہیں تو دکھا دیں گے۔ کہ آج کے کٹے کا بہت بُرا پھل چکھو گے بھالُو پھر بھالو ہنومان کا ریچھ ہے۔ فاختہ کی دُم نہیں۔ بہا بگھیرا تو اس کو کون نہیں جانتا۔ گردن میں زنجیر پڑ گئی ہو۔ تو خبر نہیں۔ لیکن

تئیں بھیڑیا سمجھتا تھا۔ لیکن پھر آدمی کا بچہ تھا۔ ماں کی نصیحت کو بھول بھول جاتا تھا۔ شیر سے رستے میں کبھی کبھی ملاقات ہوتی تھی زلفی نے چاہا بھی۔ کہ صاحب سلامت پیدا کرے۔ لیکن شیر نے ہی مُنہ نہ لگایا۔ اب کچھ عرصے سے شیر کی آمد و رفت اس طرف زیادہ رہنے لگی تھی۔ وجہ یہ تھی۔ کہ چودھری بھیڑیوں کا سردار بہت بُوڑھا ہو چلا تھا۔ اور نئی پود کے بھیڑیئے اب اس کی کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ شیر خاں نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ اور جوان بھیڑیوں سے رسم پیدا کرنی شروع کی۔ کم سنی میں عقل تو کچی ہوتی ہی ہے۔ اکثر نادان بھیڑیئے کل کی پیدائش بچے کھچے شکار کے لالچ میں شیر خاں کے ساتھ رہنے لگے۔ چودھری کا ضعف اب اس حد کو پہنچا تھا۔ کہ وہ اپنے اختیارات کو پورے طور پر عمل میں نہ لا سکتا تھا۔ ورنہ اس کو یہ ذلت کب گوارا ہو سکتی تھی۔ کہ ایک آزاد قوم کے نوجوان بے غیرت بن کر شیر خاں کی غلامی کو اعزاز کا تمغہ سمجھیں۔ شیر خاں کا وطیرہ اب یہ تھا۔ کہ جوان بھیڑیوں کو چاپلوسی کی باتوں سے گمراہ کرتا تھا۔ اور تاسف کر کے ان سے کہتا تھا۔ "ارے بدنصیبو۔ یہ تمہاری جوانی۔ یہ پھرتی۔ یہ صیادی۔ اور پھر کیا خدا کی پھٹکار ہے۔ کہ ایک بُوڑھے مرن ہار بھیڑیئے

اور ایک دو ٹانگ کے پتلے یعنی آدم زاد کی غلامی کرتے ہو۔
بلکہ مشہور تو یہ ہے۔ کہ اس آدمی کے لڑکے سے تم چار آنکھیں
تک نہیں کر سکتے۔ آفرین ہے اس کی آدمیت پر۔ اور حیف ہے
تمہاری گرگیت پر۔ کہ ایسے کمزور جانور سے ایک پل آنکھ نہ ملا
سکو"۔ بھیڑیئے یہ ملامت سُن کر سخت شرمندہ ہوتے تھے۔ اور
غیرت کے مارے گردنیں جھکا جھکا کر غرّانے لگتے تھے۔

بگھیرے کا تردّد

بگھیرا جس کی فہم و فراست جنگل جنگل مشہور تھی۔ یہ سب خبریں
سُنتا رہتا تھا۔ زُلفی کو سمجھاتا تھا۔ کہ "دیکھو صاحب زادے ہوشیار
رہنا۔ ایک نہ ایک دن یہ شیر خاں تم کو چٹ کر جائینگے"۔
زلفی سُن کر ہنستا تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ تمہارے اور برادری
کے ہوتے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر بھالو جی میرے موٹے گرو
بھی تو ہیں۔ گو ان کو خورد و خواب سے کم مُہلت ملتی ہے لیکن میری
حمایت میں تو وہ بھی بھوں بھوں کر کے دو چار ٹکّے ٹکا ہی دینگے"۔
اب ایک دِن کا ذکر سُنئے۔ جب دن چڑھے گرمی زیادہ ہوئی
تو بگھیرا اور زلفی باتیں کرتے ہوئے دُور ایک بن میں جا نکلے۔

درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں دیکھ کر ایک ستھری سی جگہ بیٹھ گئے۔ زلفی بگھیرے کی نرم گردن پر سر رکھ کر لیٹ رہا۔ بگھیرا بالکل چپ تھا۔ اور اکثر آنکھیں بند کر کے دایاں پنجہ چاٹنے لگتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ بہت فکر مند ہے۔ زلفی کو چھاؤں ایسی بھلی لگی۔ کہ آنکھ جھپکنے لگی۔ بگھیرے نے سوچتے سوچتے زلفی کو ہوشیار کیا۔ اور کہا۔ "زلفی۔ زلفی۔ بار بار کہہ چکا ہوں۔ کہ شیر تمہارے خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔ مگر تم کو مطلق خیال نہیں۔ اگر تم اس بات کو نہ سمجھے۔ تو سخت پچھتاؤ گے"۔

زلفی نے آنکھیں کھول کر کہا۔ "بار بار کہنا کیسا۔ آپ نے تو یہ بات اپنی دفعہ کہی ہے۔ کہ سامنے کی جھاڑی پر اتنے بیر بھی نہ ہوں گے۔ (زلفی کو گنتی کہاں آتی تھی۔ کہ ٹھیک ٹھیک بتاتا) پر اس وقت اِس ذکر کی کیا ضرورت تھی۔ میرا تو نیند کے مارے بُرا حال ہے۔ آپ کو شیر خاں کی پڑی ہے۔ وہ تو یونہی بکا کرتا ہے۔ نام کو تو شیر ہے۔ پر سوائے مور کی طرح اِترا اِترا کر ناچنے اور جھنکارنے کے اس کو آتا ہی کیا ہے"۔

بگھیرا۔ ذرا اُٹھ کر بیٹھو۔ یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے۔ کچھ خبر بھی ہے۔ پہلے تو شیر دل ہی دل میں تمہارا دشمن تھا لیکن

اب اس کی عداوت کسی پر پوشیدہ نہیں۔ مجھے تو شروع ہی سے ایک ایک بات کا علم ہے۔ اب بھالو جی کو خبر لگ گئی ہے۔ بھیڑیوں کے بچے بچے کی زبان پر یہ ہی قصہ ہے۔ جنگل میں جگہ جگہ اسی کا چرچا ہے۔ چرند پرند کون نہیں جانتا۔ دور کیوں جاوٗ۔ وہ سامنے درختوں کی اوجھل جو ہرنوں کی بھولی بھولی ڈاریں چرتی ہیں۔ ان تک کو شیر کی عداوت کا حال معلوم ہو گیا ہے۔ خود طباقی نے کئی دفعہ صاف صاف تمہارے منہ پر کہا۔ پر افسوس تمہارے کان پر جوں نہ چلی ۔

زلفی ۔ واہ واہ ۔ یہ تو آپ نے خوب یاد دلایا۔ طباقی کا حال تو میں نے آپ سے کہا ہی نہیں ۔ ایک دن اُس بے غیرت نے مجھے ننگا دھڑنگا کہہ کر چھیڑا۔ مجھے بھی غصہ آیا۔ اور دو ڑ کر دم پکڑ لی۔ اور ادھر اُٹھا کر اتنی جبک پھیریاں دیں ۔ کہ یاد ہی کرتا ہوگا۔ جب چیخا چلایا۔ تو دھائیں سائی ایک درخت سے دے مارا۔ دور جا کر پڑا۔ اور دو چار لڑکنیاں کھا سیدھا منہ ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا اس زور سے بھاگا۔ کہ ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے ۔

زلفی اتنا کہہ پھر زور زور سے ہنسنے لگا ۔

بگھیرا۔ بڑی بے وقوفی کی حرکت تھی۔ طبابتی بڑا حرفوں کا بنا ہے۔ اُس کو یار بنا لیتے تو بہت سی باتیں معلوم ہوتی رہتیں۔ یہ بڑی نادانی تھی کہ اُس کو مار کر بھگا دیا۔ پھر سوئے جاتے ہو ذرا سنبھل کر اپنے سہارے بیٹھو۔ بات یہ ہے کہ اِس جنگل میں تو کسی کی مجال نہیں۔ کہ تم کو ہاتھ لگا سکے۔ لیکن مشکل یہ بنی ہے کہ چودھری بڈھا ہو چلا ہے۔ اور اب کوئی دِن جاتا ہے۔ کہ اس سے شکار نہ مارا جائے گا۔ جس دن یہ نوبت آئی۔ اُسی دِن برادری والے اس کی چودھرات چھین لیں گے۔ تم کو کیا خاک یاد ہوگا۔ دُودھ پیتی جان تھے۔ دس برس سے زیادہ کا زمانہ گذرتا ہے۔ کہ جس وقت تمہارے بھیڑیئے اماں باوا نے تمہیں پنچایت کے سامنے لاکر ڈالا۔ تو بہت سے بھیڑیوں کو تمہارا غول میں شریک ہونا ناگوار ہوا۔ وہ بھیڑیئے اب تک جیتے ہیں۔ جو اُس وقت جوان تھے اب بُڈھے ہیں۔ اور جو بچے تھے۔ وُہ جوان ہو کر شیر کے چیلے بنے ہیں۔ اور تمہارے خون کے پیاسے اور گوشت کے بھوکے ہیں۔

زُلفی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ مجھ میں وُہ کون سا نقص ہے۔ کہ بھیڑیئے مجھ کو اپنی برادری سے نکال دیں۔ اِسی جنگل میں

پڑے گا۔

بگھیرے نے یہ خواہ مخواہ کے اعتراض اس وجہ سے پیدا کئے تھے۔ کہ اژدھے کے حالات سے واقف نہ تھا۔ اور ناواقفیت کی حالت میں حیوان کو حیوان سے جس قدر بدگمانی ہو کم ہے۔

بھالو۔ واہ تم بھی پرانے شکاری ہو کر کیسی بات کہتے ہو۔ انکار کیا تو کیا ہے؟ اب ایسے بھی ہم بالکل گئے گذرے نہیں ہیں۔ یوں نہ سمجھا۔ تو اور طرح پر سمجھانے کو موجود ہیں۔

یہ کہہ کر بھالو نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اور اس واجب التعظیم بھوری پوستین کا شانہ جو آج مٹی میں لتھڑ کر بہت ڈھلک گیا تھا۔ بگھیرے کے کندھے سے لڑا کر کہا۔ "چلتا بھی ہے میرے یار۔ یا یہیں کھڑا ٹالے بالے بتائے جائے گا"۔

کندھوں کے لڑتے ہی دونوں جوان باباجی اجگر کے استھان کا ارادہ کر کے چل پڑے۔

باباجی اجگر کے دوارے

کالے پہاڑ پر پہنچتے ہی دور سے دیکھا۔ کہ باباجی ابھی ابھی موکھے سے نکل کر چٹان کے پچھے پر دھوپ کھانے نکلے ہیں۔

نامراد بگھیرا ہوں۔ جو انسان کے گھر میں پیدا ہوا۔ جس کی ماں انسان کے ایک محل میں مدتوں قید میں رہ کر مری۔ رانیوں اور راجکماریوں کی مصاحبت میں زندگی عیش آرام سے بسر ہوئی۔ مگر قید پھر قید تھی لوہے کے پنجروں میں زندگی کا بڑا حصہ گذرا۔ سلاخوں میں سے ہمیشہ کھانا ملا۔ لوہے کے تسلے سے ہمیشہ پانی پیا۔ قید میں صحرا کے چشمے اور جنگل کی ہریاول کہاں۔ غرض اس حالتِ اسیری میں انسان سے طبیعت مانوس ہوگئی۔ اور یہی باعث تھا۔ کہ آج سے دس برس پہلے اور آج تک تیری جان بچانے میں کبھی کسی بات سے دریغ نہیں کیا۔ لیکن خیر اس کا ذکر فضول ہے۔ اپنا قصہ مختصر یہ ہے کہ زنداں ہی میں پیدا ہوئے۔ اور زنداں ہی میں پروان چڑھے جنگل کی صورت کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی۔ یہاں تک کہ ایک رات طبیعت بہت گھبرائی۔ اور خود بخود خیال آیا۔ کہ اے بدنصیب ماں کے بدنصیب بچے۔ تو پھر بگھیرا ہے۔ آدمی کا کھیل نہیں۔ اس خیال کے آتے ہی کچھ ایسا جنون سوار ہوا۔ کہ ایک ہی پنجے میں قفلِ زنداں کو توڑ ڈالا۔ اور جہنم قید سے اپنے آپ کو آزاد کیا۔ جس وقت جنگل میں پہنچا۔ تو یہاں کے لوگوں نے شیر سے بھی زیادہ میرا خوف کیا۔ کیونکہ میں نے آدمیوں میں رہ کر انسان کی عقل

کینچلی بدل کر نکلتے ہیں تو ذرا سوجھتا کم ہے۔ اور چوٹ کرنے میں بھی جلدی کر جاتے ہیں "۔

اژدھا بھی ایک قسم کا سانپ ہے۔ لیکن زہریلے سانپوں میں اس کا شمار نہیں۔ زہریلوں کا ہنر اُن کے دانت ہیں اور زہر کے چھالے۔ اور اژدہوں کی قوت بدن کے جوڑوں میں ہے۔ کہ جس جانور پر لپٹ کر چھپن جوڑ کس دئے۔ پھر اس مرحوم کا ذکر صرف کہانیوں میں رہ جاتا ہے ۔

بھالو نے دُور ہی سے اژدہے کو سلام کیا۔ اور پُٹھوں کے بل ادب سے ہو بیٹھا۔ ثقلِ سماعت یعنی اُونچا سُننے کا مرض جو اژدہوں کی نسل میں مدت سے چلا آتا ہے۔ !! جی میں بھی موجود تھا۔ کسی کا سلام سُنتے تو جواب بھی دیتے۔ لیکن کچھ آہٹ پاکر پُورے اٹھارہ ہاتھ تہ ہو گئے۔ اور کنڈلی پر گز بھر سیدھے ہو کر گردن پیچھے کو ڈال پھن آگے کو بڑھا لیا۔ کہ اتفاق ہی تو ہے۔ خدا جانے کیا موقع پیش آئے ۔

اور اب پُٹھی چندھی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بولے۔ " سلام بھیا سلام! آہا بھالو ہیں۔ سیونی والے! کہئے کیسے آنا ہوا؟ اور اچھا آپ بھی ہیں بگھیرے پہ بت والے! خوش رہو

شکاری خوش رہو۔ پیٹ تو اس وقت ایک نہ ایک کا ضرور خالی ہوگا۔ کہو کچھ شکار وکار کے بچن بھی نکالے ؟ کوئی بھیڑ۔ بکری۔ ہرنی۔ منڈا ٹن جنگل میں کچھ ہے بھی۔ یا سارا بن سونا پڑا ہے ؟ یہاں تو اوپر سے لیکر نیچے تک ایسے خالی پڑے ہیں جیسا اندھا کنواں "

بھالو۔ جی ہاں۔ ہم بھی شکار ہی کھیلنے ادھر آنکلے ہیں۔ بات بچا کر کہنی بھی جھوٹ میں داخل ہے۔ مگر ریچھ اژدہے کے مزاج سے واقف تھا۔ کہ ڈیل ڈول زیادہ رکھتے ہیں۔ جلدی میں ان سے کوئی کام نہیں نکل سکتا۔

اژدھا۔ اچھا گرو کو بھی شکار کا شوق ہوگیا ؟ ساتھ تو اچھا ہے۔ پھر کہو تو ہم بھی چل پڑیں ؟ تم جوانوں کا کیا ہے۔ اس کھونٹ نہ ملا۔ دوسری کھونٹ چھاپہ جا مارا۔ مشکل تو ہماری ہے۔ وہی کہاوت ہے۔ کہ اجگر کے داتا رام۔ ہمیں اور کون پوچھے ؟ فکر شکار میں ندیا کے کنارے اس سرے سے اس سرے تک پڑے پڑے اٹھوارے گذر جاتے ہیں۔ اور کچھ نہیں ملتا۔ ایک ایک جوان بندر کے لئے آدھی آدھی رات پیڑ پر چڑھنے میں گذر جاتی ہے۔ اور پھر خالی پیٹ کھسکنا پڑتا ہے۔ جنگل کا یہ حال ہے۔ کہ لکڑی میں ذرا جان نہیں۔ ایک روکھ ہماری جوانی کے تھے۔ کیسے ہرے بھرے لکڑی

کے مضبوط۔ ایک آج کل کے ہیں۔ کہ ایندھن بھی ان سے اچھا ہوتا ہے"۔

بھالو پنجے جوڑ کر بولے "ست بچن مہاراج۔ پیڑ تو اب بھی اچھے ہیں۔ یہ کہئے کہ آپ ہی کا وزن بڑھ گیا ہوگا"۔

اژدھا ہنس کر بولا "وزن تو خیر کیا رہا ہے۔ قوی البتہ اچھے ہیں۔ اور وہ بھی اچھے کیا ہیں۔ یہ کہئے کہ بڑوں کا نام قائم ہے۔ اور سچ پوچھئے تو قصور قویٰ کا ہے نہ وزن کا۔ ساری خرابی اس نئی پود کے جنگل کی ہے جو ہمارے تمہارے دیکھتے جوان ہوا ہے۔ اگلے وقتوں کے بن کہیں ایسے ہوا کرتے تھے؟ تھوڑا ہی عرصہ گذرتا ہے۔ کہ ایک دن گرتے گرتے بچا۔ جڑ پر دم جما کر پیڑ پر چڑھتا تھا۔ تھوڑی ہی دور پہنچا تھا۔ کہ جڑ چٹخی اور جڑ کے پھٹتے ہی دم نے گرفت چھوڑ دی۔ جب جڑ کا یہ حال ہو۔ تو ڈالوں کا کیا حال پوچھنا ہے۔ سب کی سب جھکنے لگیں۔ لاچار بے قابو ہو کر پھسلنا پڑا۔ پھسلنے کی آواز سنتے ہی بندر ہوشیار ہو گئے۔ اور مجھے دیکھتے ہی ایسے ایسے ناشائستہ الفاظ زبان پر لائے ہیں۔ کہ اب تک غصے سے بدن کا جوڑ جوڑ اینٹھ رہا ہے۔ کہ اگر ان بندروں کو کہیں پالے۔ تو ایک ایک کا تنکا نکال کر پھونک کی طرح پھینک دے"۔

بگھیرا یہ سنتے ہی کچھ مونچھوں ہی مونچھوں میں بڑبڑا اٹھا۔ "ارے واہ رے کیڑے۔ تجھے بھی کیا دن لگے ہیں" اس کی کچھ اچٹتی سی بھنک اژدھے کے کان میں بھی پڑی۔ اور جھٹ پھن اٹھا کر بولا۔ "ہیں! یہ کیا لفظ آپ نے کہا۔ پھر تو کہئے"؟

بگھیرا۔ جی کچھ نہیں۔ ان شریر بندروں کے ناشائستہ الفاظ کچھ یاد آگئے تھے۔ حقیقت میں نہایت گستاخ ہوتے جاتے ہیں۔ مجھے بھی کچھ یاد پڑتا ہے۔ کہ کوئی ایسا ہی سخت لفظ مٹی کا یا مٹی سے بدتر کسی چیز کا کیڑا آپ کا نام رکھا ہے۔

اژدھا غصے سے پھول اٹھا۔ اور پھنکارے مار کر پوچھنے لگا "کیا نام رکھا ہے۔ پھر تو کہو۔ مٹی کا کون؟ یہ لفظ اور ہماری شان میں اور وہ بھی بندروں کے منہ سے"!

بگھیرے نے ہچا پچا کر کہنا شروع کیا۔ جی ہاں۔ کوئی ایسا ہی لفظ تھا۔ پچھلے ہی چاند کا تو ذکر ہے۔ کم بخت نہایت بے باک ہو گئے ہیں۔ پرسوں ہی دوپہر کو پیڑوں میں بیٹھے پرچے دوڑا رہے تھے۔ کہ آپ کے دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ اور آپ بالکل پوپلے ہو گئے ہیں اور سوائے بکری کے بچے کے وہ بھی جو دودھ پیتا ہو۔ اب آپ کسی چیز کے قابل نہیں رہے۔ کیا عرض کروں۔ یہ بندر نہایت بے ادب

تیرے حق میں پیغام اجل ہو گیا "

زلفی دیر تک بن میں دوڑتا ندی نالے تیرتا پھاندتا شام ہوتے گھر پہنچا۔ بھٹ کے پاس کچھ دیر دم لے کر اندر دیکھا۔ تو کوئی نہ تھا۔ بھائی سب شکار کو نکل چکے تھے۔ اماں البتہ بھٹ کے پیچھے خاموش بیٹھی تھیں۔ زلفی کو ہانپتے دیکھ کر سمجھیں۔ کہ آج بچہ کچھ پریشان ہے۔ پوچھنے لگیں " بیٹا خیر ہے۔ آج ایسے سراسیمہ کیوں ہو "؟

زلفی ۔ جی کچھ نہیں۔ شیر خاں کی شتر گربگیوں نے جان غضب میں دے دی ہے۔ آج ذرا کھیتوں میں شکار کھیلنے جاتا ہوں ۔

اتنا کہہ جھاڑیوں کو کودتا پھاندتا پہاڑ سے اتر کر ندی کے کنارے آیا۔ چاہتا تھا۔ کہ قدم تیز کر کے کھیتوں میں اترے۔ کہ ایک دفعہ ہی بہت سے بھیڑیوں کا شور سنا۔ شور سنتے ہی زلفی کے پاؤں ایک ایک من کے ہو گئے۔ گردن موڑی تو کیا دیکھتا ہے۔ ایک جوان مست بارہ سنگھا کچھ دور ندی کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر ہر طرف سے گھرا کھڑا ہے۔ سارا بدن کانپ رہا ہے۔ اور کان کھڑے کئے پھنکارے مارتا ہے۔ چاروں طرف

اژدہا۔ ہائیں۔ آپ اور بندروں کا تعاقب؟ خود شکاری نہ سہی۔ مگر شکاریوں کے اُستاد۔ دونوں صاحب جنگل کے شریف زادے اپنی اپنی قوم کے سردار۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کوئی نہایت سخت مرحلہ درپیش ہے؟

بھالو نظریں نیچی کر کے بولے "جی۔ کس کا شکار اور کس کی شرافت۔ یہ ناچیز تو محض ایک بھوری رنگت کا ریچھ ہے۔ اور اب تو ریچھ بھی نہ رہا۔ بقول شخصے 'یک مشتِ پشم'۔ وہ بھی 'از پشتِ میش' رہ گیا ہے۔ سیونی کے جنگل میں بھیڑیوں کی اولاد کو پڑھاتا ہے۔ ایک مسکین سا معلم ہے۔ جس سے آٹھویں دسویں کوئی نہ کوئی حماقت ہوتی رہتی ہے۔ البتہ یہ میرے ساتھی بے چارے ...."

بگھیرا کسرِ نفسی کا قائل نہ تھا۔ جھٹ منہ پھاڑ کچلیاں نکال زمین پر پنجہ مار بیچ میں بول اُٹھا "ایں جانب فقط بگھیرے ہیں یک کلہ و چہار جنگل۔ کورے سپاہی۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا" یہ کہہ کر کھٹ سے منہ بند کر لیا۔ اور اژدہے سے للکار کر کہا۔ کہ "اے اژدرِ کوہسار! سن لے۔ ہماری داستان بہت مختصر ہے۔ تیرے ان بندروں نے کہ پیڑوں کے رہزن۔ پھل پھلواریوں کے چور۔ باغوں کے لٹیرے اور جنگل کے قزاق ہیں۔ ہمارا آدمی کا بچہ چرا لیا ہے

لگا ہے۔ کسان کی جورو گھڑی گھڑی اُٹھتی ہے۔ اور کوئی کالی کالی چیز اس میں ڈال دیتی ہے۔ زلفی رات بھر یہی تماشا دیکھتا رہا۔ جب صبح ہونے میں تھوڑی رات باقی رہی۔ تو کسان کا لڑکا اُٹھا۔ اور ایک ہنڈیا میں آگ بھر کر دروازے کی طرف چلا۔ زلفی بھی اسی دروازے کی طرف ایک چھلانگ میں آیا۔ لڑکے نے جوں ہی پٹ کھول کر نکلنا چاہا۔ زلفی نے بھبکی سُنائی۔ اور ہنڈیا اس کے ہاتھ سے چھین چلتا بنا۔ لڑکا پہلے تو ڈر کے مارے سہما کا سہما رہ گیا۔ جب ذرا ہوش آیا۔ تو دُہائی مچانے لگا۔ زلفی اتنی دیر میں کہیں کا کہیں پہنچا تھا۔

جب بستی سے دور جنگل میں نکل آیا۔ تو جس طرح کسان کی بیوی کو آگ پھونکتے دیکھا تھا۔ خود بھی اسی طرح آگ پھونکنے لگا۔ اور دل میں کہتا جاتا تھا۔ کہ گاؤں کے جانوروں کی شکل و صورت مجھ سے بہت ملتی ہے۔ اوہو ارے رے رے۔ یہ پھول تو مرچلے۔ کہیں ان کو بھوک تو نہیں لگی۔ کچھ کھلانا چاہیے۔ یہ کہہ ہنڈیا زمین پر رکھ بہت سی سوکھی پتیاں ٹہنیاں چن کر آگ میں ڈال دیں۔ اور ہنڈیا اُٹھا بھاگنا شروع کیا۔ پہاڑ پر آدھی دُور چڑھا تھا۔ کہ ایک طرف سے سورج نکلا۔ اور بگھیرا سامنے کھڑا

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرِ نیمکش کی

بگھیرا۔ قصے تو جناب کو بے شک بہت یاد ہونگے۔ لیکن اُن کے کہنے اور سُننے کا لُطف تو جب ہے کہ چاندنی رات ہو۔ وہ بھی پُورے چار پہر کی۔ نرم اور لذیذ شکار سے شکم ہائے احباب تا حلقوم پُر ہوں۔ پھر فتراکِ بلا کے اسیروں کا تڑپنا اور لوٹنا ہماری زبان سے سُنئے۔ اس وقت مضمونِ واحد ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ ہمارا آدمی کا بچّہ بندر اُٹھا لے گئے۔ اور بندر آپ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ جس طرح ہو سکے ہمارا بچّہ ان سے دِلوا دیجئے۔

اژدھا۔ خوب! خوب! اس کو تو پھر آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بندر میرے سوا کسی کا خوف نہیں کرتے۔ اب آپ سے ان بندروں کا حال کیا عرض کروں۔ جنگل میں کوئی مخلوق ان سے زیادہ احمق مغرور اور یاوہ گو۔ ان سے بڑھ کر خود بیں۔ خود ستا و خود نما نہیں۔ بہتیرا چاہتا ہوں۔ کہ ان کو تمیز سکھاؤں۔ لیکن سوائے اس کے کہ اپنا ہی سدہ خراب کر کے بیٹھ رہوں۔ ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ بندر کے ہاتھ آئی کچھ شک نہیں کہ اس بچّے کی آج بُری گت بنی ہوگی۔ پھل جن کو وہ بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ جب ان کو توڑتے توڑتے اُکتا کر پھینک دیتے ہیں۔ درخت کی ایک معمولی شاخ جس کو ایک جگہ سے گھسیٹ کر

دُوسری جگہ لے جانے میں آدھا آدھا دن گنوا دیتے ہیں۔ اور پھر اس کو نوچ کھسوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔ تو پھر ایسی عجیب چیز جیسے آپ کا آدمی کا بچہ ہے۔ اُن کے ہاتھوں سے کب سلامت رہ سکتا ہے؟ افسوس! ہاں ذرا یہ تو فرمائیے۔ میری نسبت ان شہدوں نے کیا لفظ کہا تھا۔ بھُول بھول جاتا ہوں؟"

بگھیرا چلّا کر بولا" کیڑا کیڑا۔ اور کیڑا بھی ...... خیر مٹّی ہی کا سمجھئے۔ ایک بات ہو تو کہی جائے۔ بیسیوں باتیں آپ کی نسبت مشہور کر رکھی ہیں۔ مجھے تو کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے"۔

اژدہا۔ اچھا اچھا! اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ خود ہی تماشا دیکھ لیجئے گا۔ کہ ان گستاخوں کو کس طرح تمیز سکھاتا ہوں۔ بہت دنوں سے بھولے بیٹھے ہیں۔ یہ بتائیے کہ اس بچے کو کس طرف لے گئے ہیں؟

بھالو۔ جنگل میں جانے کدھر لے گئے ہیں۔ جدھر سُورج ڈوبتا ہے۔ اُدھر کچھ پتہ چلتا ہے۔ ہم تو سمجھے تھے۔ کہ آپ کو سب خبر ہوگی۔

اژدھا۔ مجھے بھلا کیا خبر ہو سکتی ہے۔ میں ایسے کمینوں کے پیچھے تو پھرتا نہیں۔ رہتے ہیں کہیں دس پانچ مل گئے تو کھا لئے۔

ہو گئے۔ اور دُم دبا کر اس زور سے بھاگا۔ کہ کسی کی نہ سُنی۔ زلفی بہتیرا چلایا۔ کہ اجی چوہدار صاحب سنئے تو ذرا دم تو لیجئے۔ مگر چوہدار صاحب کو اس عرصہ میں پہلی چک پھیریاں یاد آگئی تھیں۔ دورانِ سر کی شکایت ابھی باقی تھی۔ پسلیوں کی دُکھن اور دُم کی سُوجن کو ابھی تک پورا آرام نہیں ہُوا تھا۔ اس حال میں کس کی سنتے تھے۔ غرض جب گھڑی بھر رات گئی تو زُلفی نے آگ کی ہنڈیا اُٹھائی۔ اور پنج پربت پر پہنچا۔ اب تک ہنسی کے مارے یہ حال تھا۔ کہ رستے بھر قہقہے لگاتا پیٹ پکڑے پکڑے گیا۔

پنج پربت

پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر دیکھا۔ کہ آج چودھری پٹھان پر نہیں ہے۔ بلکہ پٹھان کے نیچے ایک طرف کو بہت دلگیر بیٹھا ہے۔ یہ گویا علامت تھی۔ کہ آج بھیڑیوں کی سرداری کا عہدہ خالی ہے سامنے شیر خاں دس بیس جوان بھیڑیوں کے جلو میں جو جھوٹا شکار کھا کھا کر خوب چکنے چپڑے ہو گئے تھے ٹہل رہے ہیں۔ خوشامد کا بازار گرم ہے۔ "بجا و درست"۔ "جی حضور" اور "جو حکم" کی صدائیں ہیں۔ زلفی چپکے سے آگ کی ہنڈیا لئے ایک طرف بگھیرے

ں یہ ہی خبر تھی جو سُنانے آئی تھی۔ اب مَیں جاتی ہوں۔ بسیرے کا وقت
یب ہے۔ بچے روتے ہونگے "۔

بھالو جی تو اتنی خبر سُنتے ہی خوشی سے بے دم ہو کر خاک پر گر پڑے
۔ بگھیرا سُراغ پا کر چیل سے کہنے لگا "اے چیل! چیلوں کی ملکہ! جب
ب جنگل آباد ہے۔ تو اور تیرے بچے سلامت رہیں۔ قلۂ کوہ پر آشیانہ
رہے۔ اُونچی سیج پر سونا نصیب ہو۔ پوٹے میں چارہ۔ پروں میں
ت۔ پنجوں پکڑے اور چونچوں کھائے! جو سلوک آج تُو نے ہمارے
ہ کیا ہے۔ جنگل تجھ کو اس نیکی کا اجر دے! اب کے جس دن ہرن
ر کیا۔ دِل و جگر تیری نذر کروں گا "۔

چیل۔ اتنا شرمندہ نہ فرمائیے۔ میرا اس میں کون سا بڑا کام تھا۔
یف تو اس لڑکے کی ہے۔ کہ دُور سے دیکھتے ہی مجھے پہچان لیا۔
اپنا سارا حال سُنا دیا۔

اور یہ کہہ کر چیل بسیرے کے لئے آشیانے کی طرف اُڑ گئی۔
بھالو فرطِ طرب میں خاک پر لوٹ پیٹ کر پوستین جھاڑتے ہوئے
۔ تو بگھیرے سے کہنے لگے "دیکھئے۔ دیکھئے۔ کیا ذرا سی جان ہے
ں مصیبت میں گرفتار ہے۔ اور پھر بھی منتر نہ بُھولا "۔

بگھیرا۔ کیوں نہیں۔ بھلا آپ کے یاد کرائے ہوئے منتر جیسے

کہ تجھ قصائی کی خوشامد کریں گے۔ غول کے سردار کو غول والے ہی انتخاب کریں گے۔ تو دخل در معقولات دینے والا کون ہوتا ہے؟"

زلفی کی اس بات پر خوشامدی بھیڑیوں میں ہر طرف غُل پڑا۔ اور آوازیں آئیں "او آدمی کے بچے خاموش! او بے دُم کے جانور زبان بند کر! شیر خاں کو سب کچھ اختیار ہے۔ وہ جو چاہے سو کہے"

یہ آوازیں سنتے ہی جتنے بھیڑیئے تھے سب چلانے لگے۔ اور ایسا طوفانِ بے تمیزی برپا ہوا۔ کہ برادری کے بڑے بُوڑھے مُنہ پھاڑ پھاڑ کر پچھلے پنجوں پر پُورے قد سے کھڑے ہو گئے اور چلانے لگے "خاموش خاموش!" جب ذرا غل کم ہُوا۔ تو ایک نہایت کُہن واجب التعظیم بھیڑیا کسی قدر تکلف سے اُٹھا۔ اور بولا "بھائیو بھائیو! کُتوں کی طرح لڑنے سے کیا حاصل۔ مرے بھیڑیئے کی بات پہلے سُن لو"

مرے بھیڑیئے سے مُراد چودھری تھا۔ کیونکہ بھیڑیوں میں جب تک کوئی سردار معزول ہو کر ہلاک نہیں کر دیا جاتا۔ اُس کو مرا بھیڑیا کہتے ہیں۔ اور حقیقت میں وُہ مرے سے بدتر ہوتا ہے۔ دو چار

جاتے۔ آج کیا کام دیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ میں اژدہے کے ساتھ چلتا ہوں۔ آپ پیچھے آتے رہیئے گا۔ پاؤں تو اژدہے کے بھی نہیں ہیں۔ مگر خیر ہم دونوں کسی طرح پہنچ رہیں گے۔

اژدہا یہ سُن کر بولا "واہ کیا خوب! پاؤں ہوں یا نہ ہوں۔ اپنے سے چار بانس آگے دیکھ لینا"۔

یہ کہہ کر بگھیرے کے ساتھ اژدہا بھی چل پڑا۔ بھالو بھی کچھ دُور ساتھ چلا۔ مگر تھک کر بیٹھ گیا۔ اور اب اژدہے اور بگھیرے میں دوڑ شروع ہوئی۔ اژدہا مُنہ بند کر کے شائیں شائیں کرتا تیر کی طرح چلا۔ بگھیرا بھی اُچھلتا کُودتا چوکڑیاں بھرتا روانہ ہُوا۔ جب کبھی سوچتا تھا۔ کہ آگے نکل گیا ہُوں اژدہے کو دس قدم اپنے سے آگے ہی پاتا تھا۔ کہ اتنے میں پہاڑی ندی زور سے بہتی ہوئی رستہ میں آئی۔ بگھیرا ایک چھلانگ میں پار پہنچا۔ اژدہے کو پانی میں اُترنا پڑا۔ اور مُشکل سے تیر کر بہت دیر میں کنارے پر نکلا۔ بگھیرا اتنی دیر میں بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ مگر اژدھا ایسا اُڑا۔ کہ تھوڑی ہی دیر میں بگھیرے کو جا پکڑا۔

شام تو ہو گئی۔ آسمان پر شفق پھُولی۔ اور سارا جنگل گلابی ہو گیا۔ گلابی روشنی میں اژدہے کی چمک دمک دیکھ کر بگھیرا لوٹ گیا۔ اور

اور رفتار کی تیزی پر عش عش کر کے اژدہے کی تعریف میں قسمیں کھانے لگا۔ کہ قسم ہے اُس قفلِ زندان کی جس کو ایک پنجہ میں توڑ کر اسیری سے آزاد ہُوا ہوں۔ کہ اس طُول طویل قدو قامت پر آپ کی مثل تیز گام نہیں دیکھا۔

اژدہا۔ جی ہاں بھوک بُری بلا ہے۔ اور جب غصہ بھی ساتھ ساتھ ہو۔ ہاں ذرا پھر تو فرمائیے کہ ان بندروں نے میری نسبت کیا کہا تھا؟ مینڈک یا مچھلی؟ وہ خاص لفظ کیا تھا؟

بگھیرا دوڑتے دوڑتے یکایک تھم گیا۔ اور چلّا کر بولا "بیس دفعہ تو عرض کر چکا ہُوں۔ کتنی دفعہ سُنئے گا؟ اب پھر سُننے کو جی چاہتا ہے۔ تو سُنئے اور کسی قدر تفصیل سے سُنئے۔ حشرات الارض میں سے ایک نہایت حقیر اور ادنیٰ جاندار کا نام جو آپ کی طرح مُنہ جما کر پشت اُٹھا کر دم کے سہارے سے آگے بڑھتا ہے۔ آپ کو بطور خطاب کے ملا ہے۔ آپ کے اس ثقلِ سماعت نے تو احقر کو بہت ہی گستاخ کر دیا ہے۔ اب کہاں تک صاف صاف عرض کروں؟ کیڑا اور وہ بھی مٹی کا نہیں بلکہ مٹی سے بھی بدتر کسی چیز کا کیڑا آپ کو کہنے لگے ہیں۔ اور پھر کیڑے کا رنگ بھی سُنہری یا روپہلی نہیں۔ بلکہ گہرا کرنجوا مائل بہ سیاہی بتاتے ہیں"۔

کو ہمارے حوالے کرو۔ ورنہ سمجھ لو۔ کہ ان ہی پہاڑیوں میں بُود و باش اختیار کر کے رات دن طرح طرح کے شکار نہایت لذیذ اور فربہ تمہارے سامنے مار مار کر کھاؤں گا۔ اور حصّہ بخرہ تو درکنار اُلٹے پنجے سے چچوڑی ہڈی تک تمہاری طرف نہ پھینکوں گا۔ یہ انسان ہے۔ اور انسان وُہ حیوان ہے۔ جس سے جنگل کے رہنے والوں کو بُغض بللہ رکھنا واجب بلکہ فرض ہے"۔

یہ سُن کر بہت سے پنچ بول اُٹھے " سچ تو ہے۔ اِس بلا کو دُور بھی کرو۔ جہاں کا ہے وہیں جانے دو"۔

شیر خاں۔ واہ جہاں کا ہے وہیں جانے دو کی بھی خوب کہی چوروں کو گھر دکھا کر دھن لٹوا دو۔ گنواروں کو دشمن بنا کر جنگل میں آئے دِن قیامت برپا رکھو۔ تدبیر بھی نکالی۔ تو کیا خوب نکالی۔ ارے نادانو! سوائے اس کے کوئی تدبیر نہیں ہے۔ کہ اس کو میرے سپرد کر دو۔ ہزاروں دفعہ کہہ چکا ہوں۔ کہ انسان بُری بلا ہے۔ جس سے تم ایک پل آنکھ نہ ملا سکو۔ اس کو اب بھی اپنا دوست سمجھے جاؤ۔ تو بس رونا چاہیئے تمہاری اس دانائی پر۔

چودھری نے پھر ہمت کر کے سر اُٹھایا۔ اور بولا " بھیڑیو بھیڑیو! یاد رہے۔ یہ وُہ بھیڑیا ہے۔ جس نے ہماری قوم کے ایک نہایت معزز

کرنا شروع کر دیا تھا ۔

اکثر عالی شان محلوں کے کچھ کچھ حصے باقی تھے ۔ شہر کے دو نیچے اونچے دروازے شکستہ حال اب تک موجود۔ اور برجیاں اُن پر قائم تھیں ۔ پختہ روشوں کے آثار کہیں کہیں دکھائی دیتے تھے۔ دیواریں جگہ جگہ سے پھوٹی پڑی تھیں۔ جہاں سے پتھر اُکھڑے تھے۔ وہیں کوئی جنگلی بیل یا خود رَو درخت پھوٹ نکلا تھا۔ اور اس کی ہریاول دیوار پر چھائی تھی ۔

کہیں کہیں کسی شکستہ دیوار کے سایہ اور درختوں کے مجمر مٹنے مل جُل کر تنہائی کے گوشے نہایت دلچسپ بنا دئے تھے ۔ شہر پناہ کے کنگورے اکثر گر گئے تھے ۔ اور جو نہیں گرے تھے وہ گرنے کو تھے اور تھوڑی دُور پر فصیلوں کے بُرج بھی شق ہو کر آدھے آدھے خندق میں پھسل پڑے تھے ۔ بُرجوں کے ستونوں پر ہری ہری بیلیں لپٹی ہوئی تھیں ۔ اور دریچوں میں سے جنگلی درختوں کی شاخیں باہر نکل کر ہر وقت ہوا کے جھونکوں سے جھومتی تھیں ۔

خندق میں کہیں کہیں برسات کا پانی بھرا تھا ۔ اور اس میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ۔ پیاری جانیں اُچھل اُچھل کر چاندی کے پتروں کی طرح چمکا کرتی تھیں ۔ اور نہائے دھوئے جل کوّے صبح سے شام تک

ان کے فراق میں پانی کے اوپر اوپر ہوا میں پھرکیوں کی طرح پھرا کرتے۔ دس پانچ ڈبکیوں میں دو چار مچھلیوں نے پوٹا بھر دیا۔ تو خوش ہو کر اُڑ جاتے کہ دوسرا پانی دیکھیں ۔

ویرانہ کے بیچوں بیچ پہاڑ کی چوٹی پر راجہ کا محل تھا۔ چھت کبھی کی گر چکی تھی۔ فقط در و دیوار باقی تھے۔ محرابیں موجود تھیں، خشک نہر کے کنارے چوپڑ کا فرش اور سنگِ مرمر کے فوارے ٹوٹے پڑے تھے۔ درختوں کی جڑوں نے فرش کے پتھروں کو توڑ پھوڑ کر ناہموار کر دیا تھا۔ اور سنگِ مرمر کی بیلوں پر سبز اور سرخ داغ پڑ گئے تھے ۔

محل کے چبوترے پر مہتابی کے پاس کھڑے ہو کر دیکھو تو چاروں طرف کالی کالی دیواریں دکھائی دیتی تھیں۔ چھت کسی مکان کی باقی نہ رہی تھی۔ پختہ سڑکوں کے کنارے جہاں اب گڑھوں میں پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے۔ یہ کسی وقت میں بڑے بڑے اندازے اور پن گھٹ تھے۔ یہاں پیاری پیاری لڑکیاں جن کے ہنسنے بولنے کے دن تھے آپس میں چہلیں کرتی پانی بھرا کرتی تھیں ۔

چوراہے پر جو ایک بے ڈول سا پتھر کا ٹکڑا پڑا ہے، یہ کسی دیوتا کی مورتی تھی۔ جس پر روز صبح سویرے پھولوں کے ہار چڑھا کرتے

تم نے کل کے لئے چھوڑا ہو۔ جھوٹا شکار کھانا اب تمہارا شیوہ ہے۔ اور اس سے بھی بدتر یہ ہے۔ کہ شیر خاں کے بہکانے میں آکر روز شام کو گاؤں گاؤں گشت کرتے ہو۔ اور گھروں میں سے چھوٹے چھوٹے بچے نرم چارے کے لالچ میں اُٹھا لاتے ہو۔ اور مانس کا جی لے کر اپنا دھرم کھوتے ہو۔ سچ ہے یا تم سب مر جاتے۔ کہ یہ جنگل پاک ہو جاتا۔ یا مَیں غارت ہو جاتا۔ کہ یہ دن نہ دیکھتا لیکن تقدیر میں کس کو چارہ ہے۔ تمہاری ان سرکتوں کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ مَیں تم کو نہایت بُزدل سفلہ و کمینہ جانتا ہُوں۔ اور اب تم ہی کمینوں سے میرا خطاب ہے۔ سُن لو۔ میرا مرنا یا مارنا یا مارا جانا اب یقینی ہے۔ زندگی چند روزہ ہے۔ اور جتنی ہے وُہ بے لطف اگر یہ نہ ہوتا۔ تو مَیں خلافِ دستور تم سے لڑکر اس بچے پر سے اپنی جان فدا کر دیتا۔ لیکن محض قوم کی عزّت و ناموس کا خیال ہے۔ اِس لئے مَیں کہتا ہُوں۔ کہ اگر اس آدم زاد کے خُون سے تم حذر کرو۔ تو مَیں اپنی جان سے موجود ہُوں۔ جس بھائی کا جی چاہے آئے۔ اور مجھ کو فوراً ہلاک کر دے۔ ہرگز مقابلہ نہ کروں گا۔ اس میں کم سے کم تین بھائیوں کی جان بچ جائے گی۔ اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا ہُوں۔ اگر تم نے میری بات مان لی۔ تو ایک بے گناہ

سلطنت پر سرگوشیاں ہوں۔ ایک کی جوئیں ایک دیکھ دیکھ کر کھاتا تھا۔ اور اس شغل میں اس درجہ محو ہوتے۔ کہ تھوڑی دیر میں سب کا جی گھبرا اُٹھتا۔ اور فوراً آنکھ مچولی شروع ہو جاتی ٭

بیس بیس تیس تیس بندروں کی ٹولیاں بندھ کر ادھر گھس اُدھر بیٹھ شروع ہو جاتی۔ دس بندر دالان میں گھس کر پچے میں آئے ہیں تو پانچ کا پچے سے اُچک شہ نشین پر پہنچے۔ ایک جوڑا چھجے پر سے کود صحنچی کے طاق میں سر دی کھاتا۔ تو دوسرا زینہ سے چڑھ سرا پردہ سے برآمد ہو تخت پر ناچ دکھاتا۔ اور اس غریب بوڑھے بندر کو چھیڑتا۔ جو سائبان کے قلابے میں تن تنہا لٹکا کچے گولردں کی یاد میں مصروف ہے۔ غرض دس دس کے پیچھے بیس بیس اور بیس کے پیچھے تیس تیس بندر تھے۔ کہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بھاگ رہے ہیں ٭

کبھی کبھی بہت اہتمام سے چونے کے ٹکڑے دیواروں سے اکھیڑ کر سدر کی جانب دیوانِ خاص کے گوشے میں جمع کئے جاتے ہیں۔ کبھی صحن چبوترے کی اینٹیں نکال نکال کر ان کے ڈھیر سنگ مرمر کے تخت پر چُننے جاتے ہیں۔ اور پھر اس کثرت کار میں قوت حافظہ یک لخت معطل ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھول کر کہ چونے اور اینٹ

کے خزانے کہاں جمع کئے تھے ۔ تفتیش شروع ہوتی ۔ اور دوران
تفتیش میں خفیف سی رنجشیں پیدا ہو کر دفعۃً اس زور کی لڑائی چھڑ
کر سینکڑوں بندر لہو لہان ہو جاتے ۔ اور بندریاں بچوں کو سینے
سے لگا دُور جا بیٹھتیں ۔

پھر کوئی خیال یکایک ایسا پیدا ہوتا ۔ کہ تیس تیس چالیس چالیس
بندروں کی گروہ بندی ہو جاتی ۔ اور سب کے سب پائیں باغ
میں جا کُودتے ۔ جہاں ابھی تک پھولوں اور میووں کے درخت
خود رَو حالت میں پھولا پھلا کرتے تھے ۔

ایک غول رنگتروں میں سے نکل کر ناشپاتیوں میں پہنچا ۔ تو دوسرا
امرودوں سے نکل کر کھجوروں کے جھنڈ میں جا کودا ۔ ایک نے
چمن کی روش پر گلاب کے تختوں کو روند مارا ۔ تو دوسرا مخملی گھاس
پر لوٹنے لگا ۔ درختوں کو ہلا ہلا کر پھلوں کی بوچھاڑ پر ہنسیاں ہو رہی
ہیں ۔ اور پھولوں کے ستھراؤ پر قہقہے لگ رہے ہیں ۔

باغ و چمن تو خیر اپنی جائداد تھے ۔ محلوں میں بھی کوئی ترخانہ
کوئی بھول بھلیاں ۔ کوئی تاریک سرنگ کا راستہ ایسا نہ تھا ۔ جس
کو اُنہوں نے بار بار تحقیق نہ فرمایا ہو ۔ لیکن خاک یاد نہ رہتا تھا
کہ کون سی چیزیں دیکھ چکے ہیں ۔ اور کون سی دیکھنی باقی ہیں ۔

اور پھر دو دو چار چار مل کر گردن میں باہیں ڈالے محلوں میں ٹہلتے پھرتے اور فخر کرتے۔ کہ جس طرح آدمی یہاں آباد تھے۔ اور اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ اسی طرح ہم بھی اس شہر میں آباد ہوئے ہیں۔ پختہ تالابوں اور سنگ مرمر کے پاکیزہ حوضوں سے پانی پیتے۔ اور تھوڑی دیر میں نرل جل کو گندا کر کے کیچڑ کر دیتے۔ اور پھر پانی پر لڑائیاں ہوتیں جو خشکی کی لڑائیوں سے ہرگز کم نہ تھیں۔

اور ابھی ان لڑائیوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا تھا۔ کہ اپنی تعریفوں کے گیت شروع ہو جاتے۔ قصیدے پر قصیدہ پڑھا جاتا۔ کلام میں اس بلا کی شورش ہوتی تھی۔ کہ چیختے چیختے آوازیں بیٹھ جاتیں۔ اور ممدوحین کی چندیاں مداحین کے پنجوں کی داد دیتے دیتے گنجی ہو جاتی تھیں۔ اور پھر یہی سب حرکتیں۔ اور ان کے متعلق مضامین از سر نو شروع ہو جاتے۔ یہاں تک کہ اس شہر کے ٹوٹے محلوں اور اجڑے باغوں سے بیزار ہو کر پیڑوں پر چڑھ سب کے سب جنگل کو نکل جاتے۔ اور دل میں ارمان ہوتا تھا۔ کہ جنگل والے ہم کو کچھ سمجھنے لگیں۔

آزاد قیدی

زلفی جس کی حیوانی و جسمانی تعلیم صحرا کے سخت قوانین کے مطابق ہوئی تھی۔ وہ ایسی نامعقول زندگی کو کب پسند کر سکتا تھا؟ اس ویرانے میں آئے ہوئے پورا ایک پہر ہونے کو آیا تھا منزل بھی بہت سخت طے کی تھی۔ مگر کسی بندر نے آرام کیا نہ زلفی کو تھوڑی دیر سونے دیا۔ آتے ہی سب نے ناچ رنگ شروع کر دیے۔ ارباب نشاط کی کیا کمی تھی؟ طائفہ پہ طائفہ کھڑا ہو کر اس غضب کی دھوچتیں اُڑانے لگا۔ کہ حال کا پتہ چلتا تھا نہ قال کا۔ غل تھا۔ اور بھورے بھورے بندر تھے۔ کہ ایک کا ہاتھ ایک کی دم۔ چاروں طرف اُچھل رہے تھے۔

اتنے میں ایک صاحب کی جو کم بختی آئی۔ دو پاؤں پر کھڑے ہو اِدھر اُدھر منڈیا پھیر۔ دیدے جھپکا اسپیچ کہنے لگے "اے بھورے بالوں والی بیگمو! اور اے لال منہ والے سردارو! زلفی کی گرفتاری ہماری قدیم تاریخ میں ایک نیا عہد شروع کرتی ہے۔ آپ کو علم ہوگا کہ یہ آدمی کا بچہ آج کس محنت اور کوشش سے گرفتار ہوا ہے لیکن

نے جلتا جھاڑ سر سے اُونچا کیا۔ اور اس زور سے بھنبھی پھیرتا ہُوا دشمنوں کی طرف چلا۔ کہ بھیڑیوں میں سب طرف بھاگڑ پڑ گئی۔ جہاں جس کے سینگ سمائے ادھر کو بھاگا۔ یہ اُس پہ اور وہ اِس پر۔ کوئی یہاں گرا۔ تو کوئی وہاں۔ کوئی چٹان پر سے کُودا تو کوئی کھائی میں لُڑھک گیا۔ یہ ایک پنجہ اُٹھائے تین ٹانگ سے جاگا۔ تو وہ دو ٹوٹا پنجے اُٹھائے سر کے بل تلا کرتا نوک دُم ہُوا۔ ایک دوڑتے دوڑتے دانتوں میں دُم پکڑ چکر کھانے لگا۔ تو دوسرا ٹوٹی کمر سے پچھلا دھڑ گھسیٹتا گھاس میں تلپٹ ہو گیا۔ کسی کا کان جلا تو کسی کی دم سُلگ اٹھی۔ کسی کی پیٹھ جھلسی۔ تو کسی کی تھتنی پہ آبلے پڑے۔ غرض چاروں طرف ایک قیامت برپا ہو گئی۔ اور ایک پل میں سوائے دس پانچ بھیڑیوں کے جو زلفی کے حمایتی بن کر دُور جا بیٹھے تھے جس قدر بھیڑیے تھے۔ روتے پیٹتے چیختے چلاتے دُہائی دیتے جدھر رستہ ملا بھاگ نکلے۔ اور سارے جنگل میں چراند پھوٹ نکلی ؞

جُدائی

جب اس ہڑبڑ میں شیر بھی ایک چٹان کی اوٹ میں لڑھک کر کہیں کسی کھلے منہ کے غار میں جان بچانے کو جا چھپے۔ اور باغی

کھانا شروع کر دیا۔ اور جن صاحب نے تقریر کی تھی۔ اُن کی تو وہ بُری گت ہوئی۔ کہ اگر کبھی ملاقات ہو۔ تو بس اُن ہی سے پُوچھئے گا ۔

بھوک کے مارے زلفی کی جان نکلی جاتی تھی۔ جب بالکل ضبط نہ ہو سکا تو دو چار بندروں سے اُس نے کہا۔ کہ "میں بھوکا ہوں۔ یا تو خود کھانے کو دیجئے۔ یا شکار کی اجازت ملے کہ زمین آپ کی ہے اور میں پردیسی" ۔

اتنا سُنتے ہی جوشِ مہمان نوازی سے بے تاب ہو کر تیس چالیس بندر دیواریں پھاند باغوں میں جا کُودے۔ اور پکے پھلوں کی بھری ڈالیاں توڑ کر گھسیٹتے ہوئے لاتے تھے۔ کہ رستے میں لڑائی ہو پڑی اور اس زور کی ہوئی۔ کہ اس کے بعد پھلوں کو سمیٹ کر زلفی تک پہنچانا بندروں کے بس کی بات نہ رہی ۔

زلفی سخت پریشان تھا۔ بدن پر بیسیوں نیل پڑے ہوئے نیند کے مارے بُرا حال۔ اور بھوک کے مارے غصہ بڑھتا جاتا تھا۔ شہر کے ویران گلی کُوچوں میں پڑا۔ شکار کے لئے پردیسی کی صدا لگاتا۔ مگر کہیں سے جواب نہ ملتا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا۔ کہ اس سے بدتر جگہ جنگل میں کہیں نہ ہو گی۔ اُستاد نے جو کچھ

فرمایا تھا۔ وہ سب سچ نکلا، یہ بندر حقیقت میں بڑے ہی نالائق۔ ناہنجار ہیں۔ اُن کے ہاں نہ کوئی برادری کا قانون ہے نہ شکار کا دستور العمل۔ اور پھر اس جگہ کا کوئی چودھری نہیں۔ کہ جس سے فریاد کیجئے، زبان رکھتے ہیں محض چیخنے کے لئے۔ اور ہاتھ ہیں جن کی انگلیوں نے سوائے چوری کرنے اور چٹکیاں لینے کے کوئی ہنر نہیں سیکھا۔ اگر میں یہاں بھوکا مرگیا۔ یا کسی جانور نے مار ڈالا۔ تو کسی کا قصور نہیں۔ اپنی ہی خطا ہے، کیا کروں جو جنگل میں پھر پہنچ جاؤں؟ موقع ملے تو بلا سے بھاگ ہی جاؤں۔ بھالو پیٹیں گے تو بہت۔ مگر ان بندروں کے ساتھ کب تک بیٹھا گل کترا کروں گا۔

یہ سوچ آنکھ بچا زلفی فصیل کی طرف چلا، دیوار پر چڑھ گیا تھا کہ بندروں نے دیکھ لیا اور دوڑ کر پکڑ لائے۔ اور سمجھانے لگے کہ بے وقوف تجھ کو اب تک اپنے بُرے بھلے میں تمیز کرنی نہ آئی دیکھ تو یہاں کیسا خوش ہے۔ کس حال سے کس درجہ تک ہم نے تجھ کو پہنچایا۔ پھر بھی ہمارا احسان نہیں مانتا"۔

زلفی کچھ بولنے کو ہوا۔ لیکن بندروں نے اِس خیال سے کہ آئندہ یہ لڑکا اپنے کسی محسن کا احسان نہ بھولے۔ اُس کے چٹکیاں لینی شروع کر دیں، زلفی زبان سے کچھ نہ بولا۔ مگر غصہ سے دانت

پیتا تھا۔ کہ اتنے میں دو چار موٹے موٹے بندروں نے اس کو پکڑ لیا۔ اور گھسیٹتے ہوئے تال کی طرف لے گئے ۔

یہ تال اس ویرانے میں عجیب منظر تھا۔ محل کے ایک طرف اونچا بند باندھ کر بیچ میں بڑا تالاب بنایا تھا۔ چاروں طرف سنگِ سُرخ کی سیڑھیاں تھیں۔ اور چوڑے بند پر پتھروں کا فرش۔ پاکیزہ چشموں اور آبدار نہروں کا پانی تو اب اِس تالاب میں کہاں سے آتا۔ برسات کا پانی البتہ نشیب میں کچھ بھرا رہتا تھا۔ باقی حصہ جو خشک پڑا تھا اس میں موٹی موٹی گھاس اور نرسل کھڑے ہو گئے تھے۔ اور تال کے بیچ میں سنگِ مرمر کی ایک بارہ دری تھی۔ جس میں مانیاں اور راج کماریاں جھروکوں میں بیٹھ کر تال کی سیر کیا کرتی تھیں ۔

اوپر کا بُرج شق ہو گیا تھا۔ اور اس کا آدھا ٹکڑا اندر پڑا تھا۔ اور اس کے ملبہ سے وہ سرنگ کا رستہ جو تال کے نیچے نیچے محل سے بارہ دری میں آنے کا تھا بالکل اَٹ گیا تھا۔ چاروں طرف خوب صورت ستونوں اور محرابوں میں سنگِ مرمر کی جالیاں قناتوں کی طرح لگی تھیں۔ جالیوں کو چھوڑ کر در و دیوار پر پچی کاری کا کام تھا۔ ہر پھول میں عقیق و یشب اور ہر پتے میں سبزے در

ہمارا خیال صحیح ہے۔ پس تم کو چاہیئے کہ ہماری خُو بُو۔ رگ و پے عادات و خصائل سے آگاہ ہو جاؤ۔ تاکہ جنگل میں ہماری تعریف کر سکو اور جنگل میں رہنے والے ہماری عزت کو اپنا فخر سمجھنے لگیں "

زلفی کو سوائے ہاں ہاں کرنے کے چارہ ہی کیا تھا؟ بندروں کا اژدھام بڑھتا جاتا تھا۔ اِکائیاں دہائیاں۔ سینکڑے کب کے ختم ہو گئے تھے۔ اب تو ہزاروں اور لاکھوں پر نوبت تھی۔ قافلے پر قافلہ اور کارواں پر کارواں تھا۔ کہ چلا آتا تھا۔ تال کی سیڑھیوں پر۔ پختہ گھاٹوں کے اُونچے چبوتروں پر ہزاروں کر کٹ کر کا رہا تھا۔ اگر بیچ بیچ کسی کا دم ٹوٹ جاتا تھا۔ تو سامعین اس وقفہ کو اپنے گلو خراش نعروں سے پُر کر دیتے تھے۔ اور اس شورِ بے ہنگام کا سلسلہ کہیں ختم نہ ہوتا تھا۔

زُلفی اس غُل کو سُن سُن کر گھبرایا جاتا تھا۔ اور دِل میں کہتا تھا۔ ہو نہ ہو کسی باؤلے گیدڑ نے ان بندروں کو کاٹ کھایا ہے۔ کیا عجب ہے کہ میاں طباقی وارفتہ مزاج ہو کر اس راہ سے گُذرے ہوں۔ اور اس وقت ان بندروں کو ہڑک اٹھی ہو۔ دیکھئے رات کو بھی سوتے ہیں یا یُوں ہی رت جگا رہتا ہے۔ اہاہا۔ یہ آسمان پر بادل کا ٹکڑا کیسا آیا۔ اور دیکھو چاند کی طرف پھر پھر اُڑا چلا آتا

ہے۔ایک ذرا اور بڑا ہوتا تو اندھیرا ہوتے ہی یہاں سے نکل جاتا۔
لیکن ہاتھ پاؤں تو چُور ہو رہے ہیں۔ بھاگا کس سے جائے گا ؟

بگھیرے کا دھاوا

اور اسی بادل کے ٹکڑے کو زُلفی کے دو دوست شہر پناہ کے
سایہ میں کھڑے خندق سے دیکھ رہے تھے۔ کہ کب چاند چھپے۔
اور وہ شہر میں داخل ہوں۔ اژدہے کے ساتھ بگھیرے
کی ہمت بھی نہیں پڑتی تھی۔ کہ بندروں کی ایسی بے شمار جمعیت
پر یوں ہی بے سوچے سمجھے حملہ کر بیٹھیں۔ جنگل کے شکاری جانور
بندروں کا حال خوب جانتے تھے۔ کہ بندروں کا بھی یہ اصُول تھا
کہ جب تک ایک دُشمن کے مقابلے میں سَو نہ جمع ہو جائیں۔ مقابلہ
نہ کرتے۔ پھر ایسے بہادروں کو جنگل میں کون پُوچھتا ؟
اژدھا دیوار کے نیچے نیچے دور تک پھیلا پڑا تھا۔ کہ پھن اُٹھا کر
بگھیرے سے بولا۔ "لیجئے بندۂ درگاہ تو رخصت۔ شہر پناہ کے دوسری
طرف کچھ حصّہ دیوار کا میرے چڑھنے کے قابل ہے۔ اور اُترتے
وقت ایسی ڈھلوان زمین مل جائے گی۔ کہ چُپ چاپ موقع پر پہنچ

جاؤں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ اور خبر ہوئی بھی۔ تو بندہ تیری پیٹھ پر کود کر کان کاٹنے سے تو رہے۔ البتہ آپ کو کسی قدر......؟

بگھیرا۔ جی ہاں میں سمجھا۔ پشت و شکم کا مضمون تو اس وقت خارج از بحث ہے۔ کمزوروں سے زور آزمائی اپنا شیوہ بھی نہیں۔ مگر کچھ ایسی ہی بات آپڑی ہے۔ بھالو بھی اس وقت ساتھ ہوتا تو بہتر تھا، خیر وہ ہو یا نہ ہو۔ ذرا یہ بادل کا ٹکڑا چاند پر آجائے۔ تو بندہ آپ سے پہلے جان کھونے کو مستعد ہے۔ معلوم ہوتا ہے تال کے کنارے مشورے ہو رہے ہیں۔ غل تو دیکھئے کس بلا کا ہے۔

اژدہے نے پوری بات بھی نہ سنی اور کھسکنا شروع کر دیا۔ اور شہر پناہ کی دوسری طرف پہنچ بندروں کو دیکھتا بھالتا دیوار پر چڑھنے لگا، اس عرصہ میں بادل کا ٹکڑا چاند پر آگیا۔ اور زخمی دل ہیں کہنے لگا۔ کہ دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔ کہ بندروں پر پنجوں کی آہٹ سُنی۔ فوراً سمجھ گیا کہ بگھیرا کمک کو آیا ہے۔

چاند کے چھپتے ہی بگھیرا ٹوٹی فصیل پھاند کر دوڑتا ہوا اس صفائی سے گھاٹ پر پہنچا۔ کہ دم تک نہ ٹوٹا۔ کاٹنے اور نوچنے میں

سوکھوں میں چھپ جاؤ۔ اور اے جنگل کے مسافر سُن لے۔ کہ جہاں کھڑا ہے اسی طرح کھڑا رہ کہ ہم تیرے پاؤں میں کچل نہ جاویں "۔

زلفی جہاں کھڑا تھا وہیں دم سادھے کھڑا رہا۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جالیوں میں سے دیکھتا تھا۔ کہ اس گھمسان میں کہیں بگھیرے کا پتہ بھی چلتا ہے یا نہیں۔ کہ اتنے میں بندر رُوئی کے گالوں کی طرح چاروں طرف اُڑتے نظر آئے۔ اور بگھیرا دشمنوں سے لڑتا بھڑتا۔ آگے بڑھتا۔ پیچھے ہٹتا۔ دولتیاں جھاڑتا پنجہ و ناخن سے دشمن کے پرخچے اُڑاتا۔ گردنیں چبا چبا کر دائیں بائیں لاشوں کو پھینکتا بندروں کے غبار میں سے کچھ کچھ دکھائی دیا۔ زخمیوں کی چیخیں۔ مُردوں کا ماتم۔ زندوں کی بھپکیاں۔ ایک شور تھا۔ کہ زلفی کے کان پھٹے جاتے تھے۔ ہزاروں گلے تھے۔ کہ چیختے چیختے بیٹھ گئے تھے۔ اور بتیسیاں تھیں کہ دانت پیستے پیستے گھس چلی تھیں اور یہ جنگل کا پہلا معرکہ تھا۔ کہ نسل پلنگ کا ایک شریف زادہ اور وہ بھی کالے رنگ کا بگھیرا ایک ذلیل دشمن کی بے شمار جمعیت سے شوقِ شکار میں نہیں بلکہ محض اپنی جان بچانے کے لئے جنگل میں لڑا ہو۔

زلفی نے بگھیرے کو دیکھتے ہی دل میں سوچا۔ کہ بگھیرا اکیلا

نہیں گئی۔ عین وقت پر دھوکا نہ دے جائے ؎

جب بالکل اطمینان ہو گیا۔ کہ پھن سے لے کر پورے نو گز
ولہ گرہ تک جہاں دُم کے ساتھ خود بھی ختم ہوتے تھے۔ کیل کانٹے
سے درست ہیں۔ تو اب یہ تردد پیدا ہوا۔ کہ بندر اگرچہ حقیر دشمن
ہے۔ لیکن پھر دشمن ہے۔ لڑائی کا موقع ہے۔ کہیں کسی بات میں کوئی
کسر نہ رہ جائے۔ اور اس سوچ بچار میں اژدہے نے بہت سا
وقت ضائع کیا ؎

لڑائی کا حال اس وقت بہت نازک تھا۔ اِدھر تال کی سیڑھیوں
پر بندر بگھیرے کے مقابلہ میں تُلے کھڑے تھے۔ اُدھر گھاٹ پر جگنو
کی دھجیاں اُڑ رہی تھیں۔ غرض ہر طرف ہنگامہ کارزار ایسا گرم تھا
کہ شپرکو رنے طائرانِ شب بیدار کے ایلچی گھر کو دوڑا دیئے۔
اور جنگل میں لڑائی کی خبر ایسی گرم ہوئی۔ کہ کرپال ہاتھی نے بھی
پہاڑ کی تلہٹی سے سنکھ پھونکا۔ اور بندروں کی منتشر فوجیں جو دو دو
چار چار کوس پر پڑاؤ ڈالے پڑی تھیں۔ ہوشیار ہو کر پیڑوں پیڑوں
منزل پر منزل مارتی دوستوں کی کمک کو چل پڑیں۔ اور لڑائی کے
شور نے صحرا کے پرندوں کو جو درختوں کی ڈالیوں میں بیٹھے بسیرا لیتے
تھے گہری نیند سے جگا دیا۔ اور وہ دیس میں بیٹھے پردیس کی لڑائیوں

اس کہانی کا اژدہا تو پورے دس گز کا تھا۔ اگر اژدہے کا بچہ بھی گز ڈیڑھ گز کا پورے قد کے آدمی کے سینے پر مُنہ مارے۔ تو آدمی چاروں خانے چت زمین پر جا پڑے۔ اور سانس نہ لے ۔

اژدہے نے گھاٹ پر پہنچتے ہی پہلا سانٹا اس غول پر مارا جو بھالو کو نوچ کھسوٹ رہا تھا۔ اس کے بعد پھر تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اژدہے کو دیکھتے ہی ہزاروں بندر یک لخت چلّا اُٹھے۔ "بھاگو بھاگو اژدہا آگیا"! اور بھالو پر سے بندر ایسے پھٹے جیسے پانی پر سے کائی ۔

پُشت ہا پُشت سے بندروں نے اژدہے کے ستم کی کہانیاں سُن کر اپنے اخلاق و آداب کی اصلاح کی تھی۔ اژدہا ان کے حق میں موت کے فرشتے سے کم نہ تھا۔ جب سے جنگل قائم تھا۔ بندروں کو پکڑ کر نہایت شوق اور اہتمام سے کھاتا چلا آیا تھا۔ درختوں کا بادی چور تھا۔ جو ڈالوں پر اس طرح چڑھ جاتا۔ جیسے پتھر پر کائی یا دیوار پر سایہ۔ اور پھر درخت پر چڑھنے ہی میں صفائی نہ تھی۔ بلکہ بارہا سُننے میں آیا۔ کہ کسی اُونچے درخت میں ایک ٹوٹی ہوئی ڈال بے حس و حرکت لٹک رہی ہے۔ اور بڑے بڑے پُرکھا بندر بھی دھوکا کھا کر اس پر جا کُودے اور ڈال ان کو پکڑ کر شک گئی ۔

کے بوجھ سے ٹوٹنے لگیں ۔

پھنکارے کی خوف ناک آواز کے ساتھ کہیں غل کا نام نہ تھا۔ ایک سناٹا تھا۔ کہ چاروں طرف چھا گیا ۔

زلفی نے جُوں ہی جالیوں میں سے دیکھا۔ کہ بگھیرا پانی سے نکل کر سیڑھیوں پر کھڑا پوستین خشک کرتا ہے۔ بندروں میں پھر ایک دفعہ غل پڑا۔ نیچی دیواروں سے اُچک اُچک کر اُونچی دیواروں پر چڑھنے لگے کچھ ویران بت خانوں میں چلے گئے۔ اور بُتوں کی گردنوں میں باہیں ڈال ڈال کر زار قطار رونے لگے۔ بُہت سے فصیلوں پر چڑھ کنگوروں کنگوروں بھاگنے لگے۔ سیکڑوں بچے یتیم ہو گئے۔ ہزاروں بندریاں بیوہ ہو گئیں۔ ایسی خوف ناک تباہی اس قوم پہ پہلے کبھی نہ آئی تھی ۔

یہ نظارہ دیکھ کر زلفی نے قہقہے لگائے۔ اور اُلّو کی بولیاں بول کر خوب خوب چھیڑا۔ اور فتح کی خوشی میں ناچ ناچ کر دیر تک گاتا اور بگھیرے کو مبارکباد دیتا رہا ۔

جب دو چار جُھرجُھریاں لے کر بگھیرے نے پوستین خشک کر لی۔ تو سیڑھیاں چڑھ کر اژدہے سے ملاقات کو آیا۔ اور کہنے لگا۔ واقعی آج آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ اب جہاں اس قدر تکلیف گوارا فرمائی ہے تو اس لڑکے کو بھی قید سے رہا کیجئے۔ جس کے لئے یہ سب کچھ ہوا

نے پھر پُوچھا۔ تو دو چار قدم دوڑ کر پشت و کمر کو بار بار سُونگھا۔ اور بہت کچھ تامّل کے بعد بولے۔ "بہت غنیمت سمجھو کہ زندہ ہوں۔ مَیں تو سمجھا تھا کہ آج ان نابکار بندروں کے ہاتھوں اس بوڑھی پوستین کے پرخچے اُڑ کر سینکڑوں ریچھ کے بچے پیدا ہو جائیں گے۔ مگر زندگی تھی۔ جو بچ گیا۔ باباجی کا دم سلامت رہے۔ آج تو ان ہی کے ہاتھوں جان بچی ہے"۔

اژدھا۔ جان بچانے والا تو کوئی اَور ہی ہے۔ یہ فرمائیے کہ وہ لڑکا کہاں ہے؟

زُلفی کی رہائی

یہ سُن کر زلفی چلایا۔ اِدھر دیکھیے۔ ادھر! ان جالیوں کے پنجرے میں۔ باہر نکلنے کا رستہ آپ ہی نکالیے گا تو نکلے گا۔ چاروں طرف پتھر کی اُونچی اُونچی جالیاں ہیں۔ اور سر پر آدھا بُرج تلا کھڑا ہے۔ کہ اب گرا اب گرا۔

زلفی نے اتنا کہا ہی تھا۔ کہ بہت سے کوڑیالے پھنکارے مار کر بولے "باباجی۔ باباجی اس لڑکے یہاں سے نکالیئے۔ موذی کی طرح گرج رہا ہے۔ کسی آن نچلا نہیں رہتا۔ ہمارے انڈے بچے سب

ہے۔ آپ اپنا حال تو کہئے۔ روئیں روئیں سے خون ٹپک رہا ہے؟"

بگھیرا۔ ہمارے ہی روئیں روئیں سے لہو نہیں ٹپکتا ہے۔ بلکہ ہزاروں جسم خاک پر پڑے ہیں جن سے خون کے فوارے چل چکے ہیں" اور اتنا کہہ بگھیرے نے بندروں کی لاشوں کی طرف نظر دوڑائی۔ اور خون دیکھ کر ہونٹ چاٹنے لگا۔

بھالو۔ لہو بہا بلا سے۔ زلفی تو جیتا جاگتا مل گیا۔

بگھیرا۔ ملنے نہ ملنے کا حال تو آگے چل کر کھلے گا۔ اب ذرا چلیے اتنا تو بتا دیجئے۔ کہ باباجی کو جھک کر سلام کرلے، زلفی۔ ادھر دیکھو کون آتا ہے؟ یہی پہاڑ کے اژدہے باباجی اجگر ہیں جن کی بدولت ری جان بچی ہے۔ زخم تو ہمارے گن لینا۔ لیکن بندروں پر فتح نے کا سہرا ان ہی کے سر بندھا ہے۔ ذرا سنبھل جاؤ۔ اور جنگل کے ور کے موافق باباجی کا شکریہ بجالاؤ"۔

زلفی نے مڑکر نہ دیکھا تھا۔ کہ باباجی خود اس کے پاس آگئے۔ اور ں کے قد کے برابر کھڑے ہوکر پھن کا چھتر اس کے سر پر پھیلا دیا۔ لال لال دیدے پھرا کر بولے "اچھا یہی وہ آدمی کا بچہ جنگل کا اچنبھا جس کے لئے اتنی دوڑ دھوپ کرنی پڑی؟ جلد تو بہت نازک صورت شکل میں بھی بندروں سے ملتا ہے۔ اچھا بالکے۔ ذرا ہوشیار

لنے لگا۔

اژدہے نے زلفی کے شانہ پر اپنا پھن رکھ کر زلفی کی تعریف کی
ر کہا "آفرین ہے اے دل کے مضبوط اور زبان کے شیریں بچے۔ آفرین
ہے تیری دانائی کو۔ بس اب تجھ کو بہت دُور جانا ہے۔ جا اور اپنے
یزوں کے ساتھ جنگل میں خوش رہ۔ جا اور سو رہ۔ کہ چاند ڈوبنے
و ہے۔ اور اب جو کچھ یہاں ہونے والا ہے۔ بہتر ہے۔ کہ تو اس
و نہ دیکھے"۔

رقصِ اژدر

چاند پہاڑوں کے پیچھے چھپنے کو تھا۔ گھاٹوں سے لے کر فصیلوں
ت ہزاروں بندر منڈیا جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ اور جہاں تک
ر جاتی تھی۔ شہرپناہ کے کنگوروں پر بندروں کی صفیں کالی کالی
الر کی طرح لٹکی چلی گئی تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ بھالو اُٹھ کر حوض
ے پانی پینے گیا۔ اور بگھیرا زبان سے اپنی پوستین سنوار رہا تھا۔
اژدہا زلفی کے پاس سے کھسکا۔ اور دوڑتا ہوا تال کے کنارے
ے چوڑے سے میدان میں پہنچا۔ اور پہنچتے ہی سر اُٹھا کر مُنہ
ڑا۔ اور اس زور سے اس کو بند کیا۔ کہ جتنے بندر تھے سب

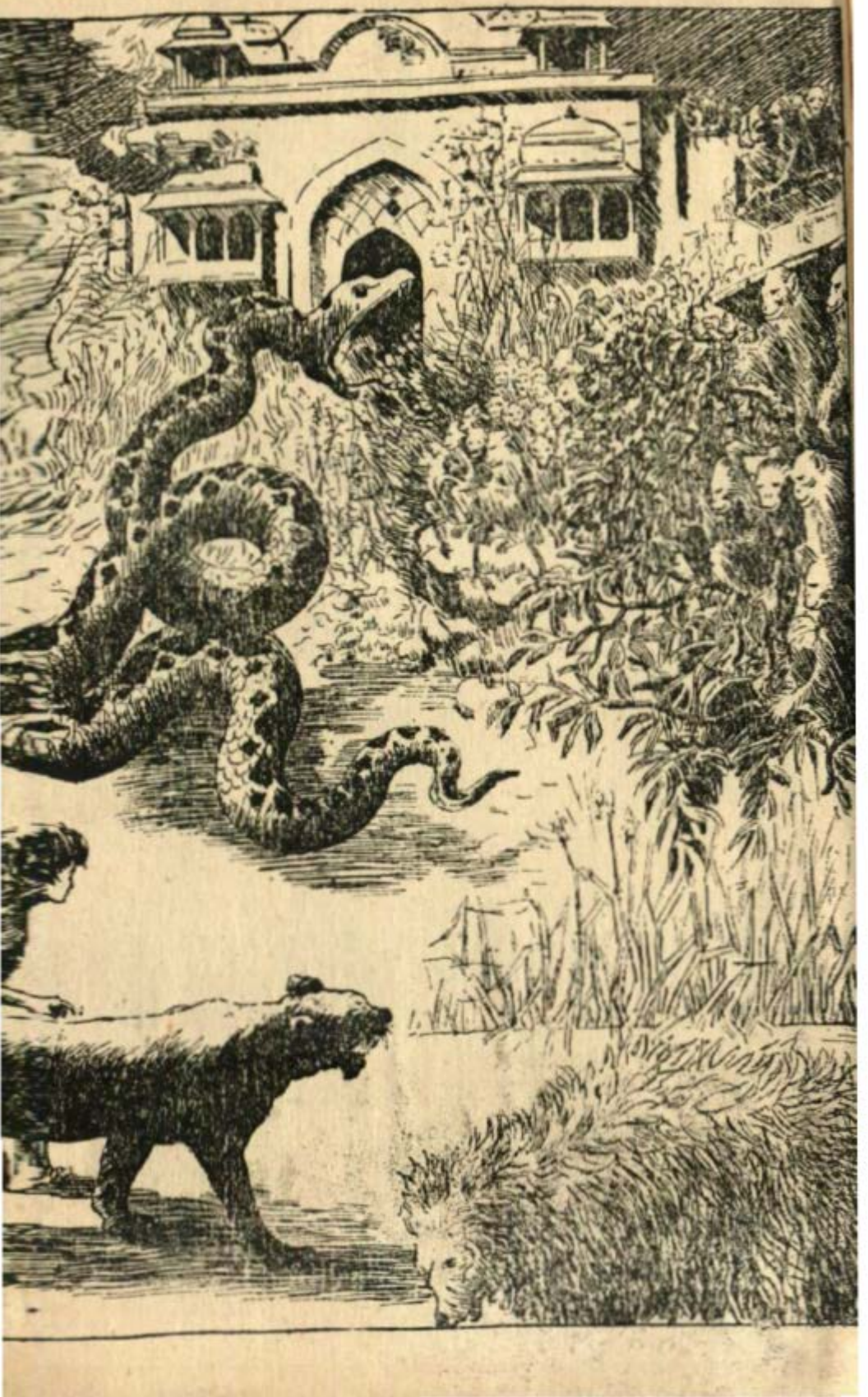

اور اب اژدہا کنڈلی کے تھیلے سے پھن اُٹھا کر بولا۔ "بندرو
بتاؤ کہ تم بغیر ہمارے حکم کے ہاتھ یا پاؤں ہلا سکتے ہو؟"
شہرپناہ کے کنگروں سے ایک نحیف آواز آئی۔ "نہیں اے
اژدہے۔ ہم بغیر تیرے حکم کے ہاتھ ہلا سکتے ہیں نہ پاؤں"
اژدہا۔ "اچھا تو ہمارا حکم ہے۔ کہ تمہاری جس قدر صفیں ہیں
ایک ایک قدم آگے چلی آئیں"

اس حکم کے ساتھ بندروں کی تمام صفیں اس سرے سے دوسرے
سرے تک بالکل بے اختیار ایک ایک قدم آگے بڑھ آئیں۔ بھالو
اور بگھیرا بھی بلا قصد ایک ایک قدم آگے بڑھ گئے

اژدہے نے مُنہ پھاڑ کر کہا۔ "اچھا اَور قریب آؤ!" سب
کے سب اَور قریب چلے آئے۔ بگھیرے کے ساتھ بھالو بھی آگے
بڑھنے کو ہوا۔ زلفی نے دونوں کو زور سے روکا۔ اور اُس کے
روکتے ہی دونوں ایسے چونک پڑے جیسے کوئی نیند سے چونکتا ہو
بگھیرے نے زلفی کے کان میں کہا۔ کہ "زلفی پیارے۔ میرا
شانہ خوب مضبوط پکڑے رہنا۔ اگر چھوڑ دیا۔ تو یوں ہی جیتا جاگتا
اژدہے کے حلق میں جا رہوں گا۔ ارے رے رے! زلفی رو
روک دیکھ میں چلا۔ اژدہے کا مُنہ کھلا ہے"

زلفی گھبرا کر بولا "بھائی بگھیرے۔ بھائی بگھیرے۔ خیر تو ہے؟ تمہیں کیا ہو گیا۔ ایسی پتھرائی آنکھوں سے اژدہے کی طرف کیوں دیکھے جاتے ہو؟ کچھ نہیں ہے۔ زمین پہ سانپ لوٹ رہا ہے۔ تمہارا جی کیسا ہے۔ مُنہ سے کیوں نہیں بولتے؟ اچھا۔ اچھا۔ گھبراؤ نہیں۔ ادھر سے پیٹھ پھیر کر نکل چلو" اور یہ کہتے ہی پیٹھ پھیر زلفی دونوں دوستوں کو شہر پناہ کے ایک سُوراخ سے نکال سیدھا جنگل کو ہو لیا ۔

اٹل قانون

شہر سے نکلتے ہی سب کے دم میں دم آیا۔ اور گرو بولے۔ "افوہ! آج سے جیسی جی چاہے قسم لے لو جو کبھی اژدہے کے پاس جاؤں" اور یہ کہہ کر بھالو سر سے پیر تک تھر تھر کانپنے لگا ۔

بگھیرے نے کہا "بے شک اژدہے کے سامنے ہماری کچھ حقیقت نہیں۔ اگر تھوڑی دیر اَور ٹھہرتے۔ تو تمہاری تو کہتا نہیں۔ میں تو اژدہے کے حلق میں کبھی کا پہنچ گیا ہوتا"۔

بھالو بولا "معلوم نہیں شام تک کتنے اسی رستہ اژدہے کے پیٹ میں پہنچ جائینگے۔ آج اس کو شکار کی کیا کمی ہے۔ اور پھر بندر

زلفی بگھیرے کی پیٹھ پر لیٹ کر ایسا سویا۔ کہ جب تک قہرن کے جھٹ میں بگھیرے نے اس کو اپنی پیٹھ سے نہ اُتارا۔ وہ بے خبر سوتا رہا ۔

ہماری چند زندہ جاوید مطبوعا…

تصانیف سید امتیاز علی تاج	قیمت	دوسرے مصنفین کی کت…
انار کلی	۹ ۰ ۰	کالے گورے
محاصرۂ غرناطہ	۵ ۸ ۰	عذرا
چچا چھکن	۲ ۸ ۰	عذرا کی واپسی
شاہکار تصاویر	۷ ۸ ۰	ہاجرہ
قرطبہ کا قاضی	۲ ۸ ۰	قاسم بن سلیم
ہیبت ناک افسانے	۲ ۸ ۰	نیک بیبیاں
پردہ	- ۸ ۰	یاسمین
تصانیف بیگم حجاب امتیاز علی		بد نصیب
ظالم محبت	۴ ۴ ۰	تذکرۃ الانبیاءؑ
اندھیرا خواب	۴ ۴ ۰	نعمت خانہ
میری ناتمام محبت	۲ ۱۲ ۰	صبح طلال شام غم
ننھی بیبیاں	۵ ۸ ۰	تصویر خانہ

ملنے کا پتہ

دار الاشاعت پنجاب لاہور

خواتین کیلئے ہماری چند زندۂ جاوید مطبوعات

مصنفہ محترمہ محمدی بیگم صاحبہ مرحومہ		دیگر مصنفین کی کتابیں	
عفت خانہ	۴۰۰	تہذیبی کشیدہ	۶۰۰
خانہ داری	۳۸۰	تہذیبی کروشیا	۶۰۰
آداب ملاقات	۱۷۰	گلدستہ کروشیا	۴۰۰
رفیق عروس	۲۰۰	روشنک بیگم	۴۸۰
کتاب راحت	۱۲۰	صفیہ بیگم	۱۸۰
سگھڑ بیٹی	۳۰۰	زہرا بیگم	۴۸۰
حیاتِ اشرف	۱۴۰	اختری بیگم	۱۸۰
چندن ہار	۱۰۰	بیگماتِ بھوپال	۲۴۰
آج کل	۱۴۰	شریف بیوی	۱۰۰
سچے موتی	۲۴۰	رسوم دہلی	۱۲۰
شریف بیٹی	۱۲۰	آہ مظلوماں	۲۰۰

مکمل فہرست مفت طلب فرمائیں!

دارالاشاعت پنجاب لاہور

نہ ہم تم کو ماریں نہ تم ہم کو مارو۔

بھالو دل میں بہت خوش ہوئے۔ باچھیں کھل گئیں۔ یہ نہیں معلوم اپنی لیاقت پر یا شاگرد کی تیزی پر۔ اور بولے "اچھا اب بھیڑیے کا بھی منتر سنا ڈالو"۔

زلفی نے دو چار تیز بولیاں بول کر اخیر میں بڑے زور سے نفیل دی۔ اور سیٹیاں بجا کر چپ ہو گیا۔

بھالو۔ اچھا اب سانپ کا منتر اور سنا دو۔ پھر چھٹی۔

زلفی نے اس سوال کے جواب میں گلے اور نتھنے پھُلا کر ایسا پھنکارا مارا۔ کہ بھیڑیا چرا رہا تھا اچھل کر دور جا کھڑا ہوا۔ اور بے اختیار منہ نیچا کر کے گھاس میں ادھر اُدھر سونگھنے لگا۔

اور اب چھٹی ملتے ہی زلفی زمین پر ہاتھ ٹھیک۔ ہوا میں دولتیاں جھاڑ۔ تالیاں بجاتا ہوا کود کر بھیڑیے کی پیٹھ پر جا سوار ہوا۔ اور دونوں پاؤں ایک طرف کو ڈال کر جلدی جلدی لگا ایڑیاں چلانے اور بھیڑیے کی پسلیوں پر ڈھول بجانے۔ اور بھالو کے ایسے ایسے منہ چڑائے۔ کہ جو جنگل والا ادھر سے نکلا۔ مارے ہنسی کے گھاس پر لوٹنے لگا۔ یا دم دبا کر بھاگ گیا۔

بھالو غصے کی صورت بنا کر پیار سے بولے۔ "دیکھو دیکھو بھی

حرکتیں کر کے دِل میں خوش ہولیں۔ ان کی زندگی کا کوئی مقصد ہی نہ تھا۔ نہ اس کی پروا تھی۔ کہ کیا کرتے ہیں۔ نہ اس کا فکر تھا۔ کہ کیا ہوگا ؟

چنانچہ ایک دن ایک صاحب ڈال پر بیٹھے جدھر کا ہاتھ تھا اُدھر ہی کی بغل کھجا رہے تھے۔ کہ دفعتہً دماغ میں ایک خفیف سا خیال پیدا ہوُا۔ سمجھے کہ بات خوب نکالی۔ بلا تامل شاخ سے کُود حلقہ احباب میں آتے ہی کہہ اُٹھے۔ کہ "اگر زلفی کو قید کر لیا جائے تو بڑا کام نکلے۔ سفر اور حضر دونوں میں آسائش ہو جائے"۔

اس پہ یارانِ طریقت بولے۔ کہ "وُہ کیا آرام سوچا ہے۔ ہم پہ بھی ظاہر ہونا چاہیئے"۔ تو فرمانے لگے "یہ لڑکا ہمارے پیڑوں میں سے ہری ہری ٹہنیاں توڑ کر لے جاتا ہے۔ اور ان کے پتے سونت کر کہیں اکیلا بیٹھا طرح طرح کی چیزیں بنایا کرتا ہے۔ اس کام کا سیکھنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ سیکھنے کو تو ہم سب کچھ ایک دن میں سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس لڑکے کو پکڑنا اب ذرا ٹیڑھی کھیر ہے"۔

اس میں شک نہیں۔ کہ زلفی کا باپ کبھی کبھی جنگل میں لکڑیاں کاٹا کرتا تھا۔ اور اس کی ماں ٹوکریاں بنا کرتی تھی۔ یہ خون کا

اس پر عملدرآمد شروع ہوا ۔

قصد اور عمل کے درمیان تامل کرنا تو بندروں کو آتا ہی نہ تھا۔ ہمیشہ ہتیلی پر سرسوں جما کرتی تھی۔ ادھر زلفی بھالو اور بگھیرے کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ کہ سینکڑوں بندر درختوں کی اوٹ چھپکے چھپکے ان کے پیچھے ہو لیا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی۔ چیل نے انڈا چھوڑا ہی تھا۔ کہ شکاریوں کی نیند کا وقت آیا۔ زلفی استاد کی گھرکیوں اور جھڑکیوں سے جی میں بہت شرمندہ تھا۔ اور یہ قسم کھا کر کہ اب بندروں میں کھیلنے نہ جاؤں گا۔ بھالو اور بگھیرے کے بیچ میں لیٹ کر آنکھیں بند کرتے ہی پٹ سے سو گیا ۔

زمین اور آسمان کے بیچ میں

اس کے بعد جو کچھ اس کو معلوم ہوا یہ تھا۔ کہ کسی نے نہایت سخت اور کھردرے ہاتھوں سے اس کے بازو پکڑ لئے ہیں۔ اور سارے بدن پر کوئی جھاڑو سی چلا رہا ہے۔ آنکھ کھول کر دیکھا۔ تو خود درخت کی چوٹی پر ہے۔ اور نیچے بھالو نے جاگتے ہی ایسی دہائی مچائی ہے۔ کہ سارے جنگل کو سر پر اٹھا لیا ہے۔ بگھیرا بھی کچلیاں نکال نکال کر ایک ایک درخت پر چڑھتا ہے اور پھسل پڑتا ہے۔ بندر پیڑوں میں دھما چوکڑیاں

ہاتھوں میں چوڑیاں پہنے نہیں دیکھا "

چیل نے دِل ہی دل میں یہ باتیں کر کے دُم کے نیچے پنجے سمیٹ لئے۔ اور بازو چلا کر اُونچی اُڑنی شروع ہوئی۔ لیکن پھر کچھ سوچا۔ اور فوراً پروں کو تان کر چُپ چاپ منڈلانے لگی۔ اور یہ علامت تھی۔ کہ کسی بات کا سخت انتظار ہے ؎

اب بجالُو اور بگھیرے کا حال سُنیئے۔ کہ اس عرصہ میں زُلفی کے پیچھے وہ بالکل دیوانے ہو گئے تھے۔ بگھیرا درختوں پر ایسا بے دریغ چڑھتا تھا۔ کہ اس سے پہلے کبھی اس کو اتنی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن کمزور شاخیں بوجھ سے ٹوٹ پڑتی تھیں۔ اور یہ دل میں حسرت اور پنجوں میں بکل چھال نوچتے ہوئے نیچے آن رہتے تھے۔ غصہ تو اپنی بے بسی اور بیکسی پر آتا تھا۔ اور ڈانٹتا تھا۔ بیچارے بجالُو کو "ارے گرو۔ کمبل کے پوٹلے۔ پہلے ہی لوندے کر کیوں نہ خبردار کر دیا۔ کہ آج اس مصیبت میں نہ پڑتا جب بچھ سے اتنا بھی نہ بنایا گیا۔ تو تُو اس غریب کو پڑھایا کیوں کرتا تھا "؟

بجالُو کو بات سننے یا جواب دینے کا ہوش کہاں تھا؟ روتا پیٹتا۔ گرتا پڑتا۔ لوٹتا لڑھکتا چلا جاتا تھا۔ کہ شاید بندروں کو پکڑ لے۔ دوڑتے دوڑتے دم پھول گیا تھا۔ اور پیٹ کا پانی اس طرح بولتا تھا۔ جیسے

مدت سے چلہ کھینچ رہے تھے۔ آج ہی کینچلی بدل کر باہر آئے ہیں کہ ذرا اُجالے میں بیٹھ کر نیا رُوپ لیں۔ پھن سے لے کر دُم کی نوک تک۔ ایک انچ کم نہ زیادہ۔ پورے تیس فٹ کے بھتے جس کے نمبری حساب سے دس گنہ ہوئے۔ وزن کا حساب لگانا مشکل ہے مگر پیٹ پہ سے اتنے موٹے تھے۔ کہ اچھے خاصے جوان بندر کی گودی میں مشکل سے آتے۔ اب رہا رنگ رُوپ۔ تو بس اس کا حال نہ پوچھیے۔ سنہری زمین پہ رُوپے کا باریک ماہی جال۔ اور اس پہ سیاہ زنجیرے میں چمپئی گل بوٹے ڈھلتے سُورج کی کرن میں پہاڑ پہ بجلیاں کوندا رہے تھے۔ اور یہ کالے پہاڑ والے جوبن کی ترنگ میں اینٹھ اینٹھ کر بیس ہاتھ کا موٹا رستہ بڑی آب و تاب سے بٹے رہے تھے۔ بل پہ بل کھا کر طرح طرح کی کنڈلیاں مارتے تھے۔ مگر کسی نشست پہ قرار نہ تھا۔ کبھی لہر میں آکر اپنے ہی ڈھیر پہ قدِ آدم بلند ہو جاتے۔ اور محض سُستی اُتارنے کے لئے دو دو چار چار گز پیچھے ہٹ کر تیتر دن پر چین کی موگریاں مارتے۔ اور جب ناشتہ کا خیال آتا۔ تو جلدی جلدی زبان نکال کر ہونٹ چاٹنے لگتے تھے ؎

اژدھے کو دُور سے دیکھتے ہی بھالو نے کہا "بھیا بھنگیر سے شُکر کرو۔ کہ ابھی تک کھانے کو کچھ نہیں ملا ہے۔ ذرا ہوشیار رہتے

تھے ۔

وُہ ٹوٹا بُرج جہاں پیپل کے بُہت سے چھوٹے بڑے درخت اُگ آئے ہیں۔ جن کے پتّے دھُوپ میں چمک چمک کر ہوا کے جھونکوں سے تالیاں بجاتے ہیں۔ یہ اس شہر کا عالیشان مندر تھا۔ یہاں صبح شام شنکھ اور گھنٹے بجتے تھے۔ پُجاریوں کے میلے لگے رہتے تھے ۔

مگر اب وُہ صورتیں کہاں ؟ نہ راج رہا نہ پاٹ۔ بستی کے بسنے اور بسانے والے سب خاک میں مل کر خاک ہو گئے۔ اب تو یہ ایک ویرانہ ہے۔ اور اس پہ بندروں کی حکومت کا ڈنکا۔ کہ رات دن پڑا بجتا ہے ۔

وہ اس شہر کو اپنا شہر مشہور کرتے اور خود شہری بن کر جنگل والوں کو دہقانی بتاتے ہیں۔ مگر آج تک ان مسخروں کی سمجھ میں یہ نہ آیا۔ کہ یہ محل اور مکانات کس نے بنائے تھے۔ اور کیوں بنائے تھے۔ اور ان میں کس طرح رہنا چاہئے ۔ مگر زعم یہی تھا۔ کہ ہم ہر بات میں انسان کی نقل اتار سکتے ہیں ۔

راجہ کے دربار میں جہاں کبھی درباریوں کا ہجوم رہتا تھا سینکڑوں بندر ایک کے پیچھے ایک بیٹھ جاتا۔ اور بجائے اس کے کہ رموزِ

افسوس ہے۔ کہ تہذیب و ترقی تو درکنار۔ بندروں کو اپنی آسائش و آرام کا بھی خیال نہیں! اس فخر سے کیا ہوتا ہے۔ کہ ہماری قوم اب تک حیوانات عالم کی بعض قوموں میں سب کی مورث اعلیٰ مانی جاتی ہے۔ کوئی ہنر سیکھ کر دکھاؤ تو جانیں۔ ورنہ سلام ہے آپ کی اس بزرگی اور قدامت کو۔ یہ بچہ انسان ہے۔ اور انسان کو کیا نہیں آتا؟ کیا عجب ہے۔ کہ اس وقت ہم ہی میں کوئی بڑا بوڑھا بندر ایسا بھی موجود ہو۔ جس کی کمر پر بندر والے کی رسی کا نشان اور جس کے کانوں میں اب تک ڈگڈگی کی صدائیں گونج رہی ہوں۔ بہتر ہے۔ کہ وہ اُٹھے اور بتائے کہ وہ کون سے ہنر ہیں جو انسان کو نہیں آتے"؟

زلفی نے اتنی ہی تقریر سنی تھی۔ کہ ڈر کر موٹی موٹی گھاس کے دس پانچ پتے توڑ لئے۔ اور ان میں جلدی جلدی انگلیاں چلانے لگا۔ جیسے کوئی بوریے والا بوریا بُنتا ہو۔

بندروں پر کچھ تو تقریر کا اثر ہوا۔ اور کچھ اس نئے کھیل کو دیکھ کر سب کے سب زلفی کی نقل اتارنے لگے۔ مگر کب تک! تھوڑی ہی دیر میں گھبرا گئے۔ اور سب کو یک لخت اس زور کا خفقان اُچھلا۔ کہ ایک بندر نے دوسرے بندر کی دم پکڑ کر بے اختیار

نہیں آیا ہے۔ بھالو بھی ضرور کہیں آس پاس ہوگا۔ یہ سوچتے ہی زُلفی نے جالیوں کے پاس منہ لاکر بگھیرے کو آواز دی۔ کہ "بگھیرے بگھیرے جس طرح ہو پانی کے پاس پہنچ کر غوطہ لگالو۔ پھر دشمن کچھ نہ کرسکے گا"

زلفی کی آواز بگھیرے نے سُنی۔ اور سُنتے ہی اُس کی ہمت دوچند ہوگئی۔ اور اب بگھیرے نے پانی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ بندروں نے روکنا چاہا۔ اور ایک ایک قدم پر بیسیوں اپنی جانیں فدا کرنے لگے۔ لیکن بگھیرا برابر سیڑھیاں اُترتا رہا۔ کہ سمتِ صحرا کی دیوار سے کالے سے کمبل کا ایک دقیانوسی جھنڈا بلند ہوا۔ اور بھالو کا نعرۂ جنگ جیسے اُونچے پیڑ میں کھٹکھٹا بندھا ہو۔ سب کے کانوں تک پہنچا۔ زُلفی سُنتے ہی اُچھل پڑا۔ کہ اُستاد آن پہنچا۔ اب فتح میں کس کو کلام ہے!

کمک

اس ضعیفی میں بھالو بیچارے کو ایسی مصیبت کب اُٹھانی پڑی تھی؟ اپنی بساط سے زیادہ تیز چلا۔ پھر بھی اتنی دیر میں پہنچا۔ کہ بگھیرا لڑتے لڑتے گھبرا گیا تھا۔ اور اب شہر پناہ کی منڈیر سے بھالو للکارے "بھیا بگھیرے۔ خبردار جی نہ چھوڑیو۔ مَیں آن پہنچا ہوں۔ دیکھ یہ دیوار

پر چڑھا۔ اور یہ نیچے دھم سے کُودا۔ اور اب تیرے پاس پہنچا۔ دل پر ذرا میل نہ لائیو۔ ایک میرا ذرا انتظار اَور کرلے۔ اے بندرو۔ بے ایمانو تم کس دن جنگل سے غارت ہوگے "

اس آواز کے چُپ ہوتے ہی دیوار سے وہ جھنڈا بھی غائب ہوگیا۔ اور گھاٹ پر ریچھ کی منڈیا ابھری ہی تھی۔ کہ بندروں کا ایک بگولا اُٹھا۔ اور بھالو جنگل کا گروہ اس میں غائب ہوگیا۔ مگر بھالوؤں نے بھی عُمر بھر لونڈے پیٹے تھے۔ جھٹ پُٹھوں کے بل بیٹھ دُم کے سہارے سے چکر کاٹنے لگے۔ اور دونوں پنجوں سے بندروں کو بھوسی کی طرح جھاج میں پھٹکنا شروع کردیا۔ کہ اتنے میں پانی میں کوئی چیز دھم سے گری۔ اور چھینٹوں کے اُڑنے کی آواز ہوتے ہی زلفی سمجھ گیا۔ کہ بگھیرا دشمن سے رستہ نکال کر پانی میں پہنچ گیا۔

بگھیرے نے تال میں اُترتے ہی سارا بدن پانی میں چھپا لیا۔ فقط مُنہ باہر نکلا رہنے دیا۔ اور زور زور سے ہانپنے لگا۔ اِس عرصہ میں سینکڑوں بندر گھاٹ کی سیڑھیوں پر صف بستہ ہوگئے۔ اور بالکل تیار تھے۔ کہ اگر ریچھ کی مدد کے لئے بگھیرا پانی سے نکلے۔ تو نکلتے ہی اس کا کام تمام کردیں۔ اور یہ وقت وہ تھا۔ کہ بگھیرے نے تھوڑی سی مُنہ نکال کر جس سے خون اور پانی کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹپک

رہی تھیں۔ اژدہے کو آواز دی۔ اور جب جواب نہ ملا۔ تو سمجھ گیا۔ کہ آج اس لمبے لہری نے عین وقت پر دھوکا دیا۔ آخرکار مجبور ہو کر پانی کے سانپوں سے پناہ مانگنے کے لئے صدا لگائی ؎

بندروں کا وہ ہجوم تھا۔ کہ بھالو کو دم لینے کی مہلت نہ تھی۔ لیکن بگھیرے کی صدا کان میں پڑتے ہی دل پر ایک چوٹ سی لگی اور کہنے لگا "سچ ہے بڑے بول کا سر نیچا۔ یہ وہی بگھیرا ہے جس کو اپنے پنجہ و ناخن پر ناز تھا۔ آج ایسا معذور ہو گیا۔ کہ مٹی چاٹ کر خاک پر لوٹنے والوں سے پناہ مانگ رہا ہے" ؎

اب بابا جی اجگر کا حال سنئے۔ کہ سیدھی دیوار پر پتھروں کی رگیں پکڑتے ہوئے لہریا کاٹتے مشکل سے منڈیر تک پہنچے۔ اور ممٹی کے پتھر میں دم اٹکا کر دوسری طرف اترنے شروع ہوئے۔ کہ تک زمین پر پہنچے تھے۔ کہ ہلکا سا جھٹکا دے کر پتھر سے دم چھڑائی۔ مگر وہ ہلکا سا جھٹکا بھی اس غضب کا تھا۔ کہ منڈیر کا پتھر باہر کی طرف خندق میں گر کر دو ٹکڑے ہو گیا ؎

جب زمین پر پورے تیس فٹ اتر لئے۔ تو دیر تک کنڈلیاں مار مار کر تہ ہوتے اور کھلتے رہے۔ اور گردن سے لے کر دم تک ایک ایک جوڑ کو جانچ لیا۔ کہ زنجیر کی کوئی کڑی کسی کانٹے سے کل

کے چرچے سُن سُن کر چیں چپیں کرنے لگے ؏

اور اب وُہ وقت آیا۔ کہ اژدھا بھی میدان میں آئے۔ شہرپناہ سے گھاٹ کی شست باندھ کر ایسا چلا جیسے کڑی کمان کا تیر۔ سیدھا تیز۔ دُشمن کی ہلاکت پر آمادہ ؏

اجگر کی پھنکار

شکار کے وقت تو اژدہا شکار پر لپیٹ کر بدن کے جوڑوں سے کام لیتا ہے۔ لیکن لڑائی کے وقت اس کے حملہ کا طریق اَور ہے۔ چار پانچ ہاتھ سیدھا برچھے یا بلم کی طرح تل کر جسم کی پُوری طاقت اور وزن سے دُشمن کے ہُولا لگاتا ہے۔ یا کمر تک کنڈلی مار کر باقی جسم سے دُشمن کو کوٹ ڈالتا ہے۔ اس کے حملے کا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے۔ کہ یا تو ایک لوہے کا ہتھوڑا وزن میں تیس چالیس من کا ہو۔ اور اس کی دستگی میں سلامتیٔ عقل و حواس کے ساتھ مثل ایک ذی رُوح کے ضرب لگانے کی قوت موجود ہو۔ اور یہ ضربیں کسی خاص نشانہ پر لگاتار پڑتی ہوں۔ معاذاللہ! یا پُرانے زمانے کا کوئی قلعہ شکن منجنیق ہو۔ کہ لوہے کا ایک بہت وزنی شہتیر ہوتا تھا۔ جس کی ٹکر سے قلعہ کی دیواریں توڑ دی جاتی تھیں ؏

یہ اور ایسے ہی بہت سے چشم دید واقعات بندروں میں اگلے وقتوں سے روایت ہوتے چلے آئے تھے۔ اور کسی بندر کو اس کا علم نہ ہوا کہ اژدہے کی قوت کی کوئی انتہا بھی ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ اس کی نظر میں اس بلا کا سحر تھا۔ کہ جہاں بندر پر پڑی۔ اور بندر کی جان آدھی رہ گئی ؛

غرض اژدہے کو دیکھتے ہی ایک دم سے بندروں کی گھگیاں بندھ گئیں۔ اور یا تو ہزاروں بندر پکارے گلے صاف چلا رہے تھے یا سب کے سب ہکلاتے ہوئے جان کے خوف سے جدھر مُنہ اُٹھا بھاگ نکلے ؛

بندروں کی بھیڑ ہوتے ہی بھالو جی کو بھی دم لینے کی فرصت ملی۔ اگرچہ ان حضرت کی پوستین بگھیرے کی پوستین سے بہت دبیز تھی لیکن لڑائی میں جیسا بڑا درجہ اُس کا ہوا تھا۔ بگھیرے کا نہیں ہوا تھا۔ بندروں کو بھاگتے دیکھ کر اژدہے نے سر اُٹھا کر زور سے الٹا دم کھینچا۔ اور تین فٹ کے نل میں بھاپ بھر کر اس غضب کا پھنکارا مارا۔ کہ کوسوں تک بندروں کے منتشر جرگے جو سرد دیوانوں کی طرف دوستوں کی مدد کے لئے درختوں درختوں دوڑے چلے آتے تھے جہاں تھے وہیں کے وہیں رہ گئے۔ اور درختوں کی ڈالیاں ان

ہے۔ مناسب ہے۔ کہ ہم اس کو لے کر یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ کیونکہ اندیشہ ہے۔ کہ بندر پھر حملہ کر دیں گے ۔

اژدھا۔ مجال ہے کسی بندر کی کہ دُم تک ہلا سکے۔ خبردار بندرو جہاں ہو وہیں بیٹھے رہو ۔

اتنا کہہ اژدھے نے پھر اُلٹا دم کھینچ کر پھنکارا مارا۔ اور تمام ویرانوں میں بندر کی آواز عنقا ہو گئی ۔

اژدہے نے بگھیرے سے معذرت کی۔ کہ فی الواقع مجھ کو یہاں تک پہنچنے میں کسی قدر عرصہ ہو گیا۔ میں نے آپ کی آواز سُنی تھی۔ لیکن ایسا عدیم الفرصت تھا۔ کہ جواب نہ دے سکا۔ مگر مجھے یہ اطمینان تھا کہ آپ کو مدد کی ضرورت تو ہے نہیں۔ ویسے ہی پکارا ہو گا "

بگھیرا یہ فقرہ سُن کر جل گیا۔ اور بولا " لڑائی سخت ہو رہی تھی۔ ممکن ہے طلبِ امداد میں کوئی جملہ زبان سے بے اختیار نکلا ہو۔ وقت پر تو آپ جانتے ہیں ..... خیر یہ ہی سمجھئے۔ کہ اژدہے کو بھی اُستاد ماننا پڑتا ہے۔ اے لیجئے۔ بھالو بھی آ رہے ہیں۔ کہو گُرو کہیں چوٹ پھینٹ تو نہیں لگی "؟

بھالو چوٹ پھینٹ تو کیا بتاتے۔ ان کو سرے سے یہ ہی خبر نہ تھی۔ کہ جیتے ہیں یا بزرگوں کی ہڈواڑ میں پہنچ گئے۔ جب بگھیرے

کچلے ڈالتا ہے۔"

بابا جی ہنس کر بھالو جی سے کہنے لگے۔ "بھالو جی۔ یہ تمہارا چیلا بڑا اچنبھا ہے۔ جنگل میں کوئی جگہ بھی ایسی ہے۔ جہاں اس کے جاننے پہچاننے والے نہ ہوں۔ اچھا بالکے۔ ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو۔ ہم جالی توڑتے ہیں۔ اور اے زہریلے جائیو۔ تم بھی اپنی اپنی بانبیوں میں چلے جاؤ۔ کہ کسی کے چوٹ نہ لگے۔"

اژدہے نے جالیوں کے گرد چکر لگایا۔ اور ایک جگہ پتھر میں زرد سا داغ دیکھ کر اس پر دو چار دفعہ منہ سے ہلکی چوٹ لگائی۔ اور پھر سر کو صاف دو گز اونچا اٹھا کر پوری طاقت سے پھن کی پانچ چھ موگریاں ماریں۔ اخیر چوٹ پر جالی پاش پاش ہو گئی۔ اور اس کے گرتے ہی زلفی گرد و غبار کے بادل میں سے نکل بھالو اور بگھیرے کے بیچ میں آن کودا۔ اور دونوں کی بانہوں میں باہیں ڈال کر ان کی صورت دیکھنے لگا۔ دونوں سحرائی دوست محبت سے اس کا منہ چاٹنے لگے۔

بھالو نے زلفی سے پوچھا۔ "بیٹا تمہارے کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟"

زلفی بولا۔ "جی چوٹ تو ایسی نہیں لگی۔ مگر بھوک بڑے زور کی لگی

رہنا۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ کینچلی بدل کر نکلوں۔ اور جھٹ پٹے میں بندر سمجھ کر کھا جاؤں "۔

زلفی نے فوراً شکاریوں کا منتر سنایا۔ اور کہا " آپ سے کیا ڈروں گا۔ آپ نے تو میری جان بچائی ہے۔ آج سے میرے شکار اپنا شکار سمجھئے۔ بابا جی آپ مہا اوتار ہیں "۔

اژدھا۔ سکھی رہو بیٹا سکھی رہو۔ ہم تو اب بڈھے ہو گئے ہیں تم جوان ہو۔ پر ذرا اس شکار کا نام بتاؤ۔ جسے تم مار کر کھاتے ہو؟

زلفی۔ بابا جی شکار تو میں نہیں مارتا۔ ابھی بہت چھوٹا ہوں۔ پر ہاں۔ جنگل سے ہرنیاں اور پہاڑ سے بکریاں ہانک ہانک کر آپ کے پاس پہنچا سکتا ہوں۔ کبھی بھوک کے وقت جنگل میں آئیے۔ تو تماشا دیکھئے۔ یا اگر کبھی پھندے میں پھنس گئے۔ تو میری صفائی دیکھئے گا۔ کہ کس طرح ایک چٹکی میں بھالو اور بگھیرے کو آپ کے احسان سے سبکدوش کر دیتا ہوں ۔

یہ کہہ کر زلفی نے سب کو جھک کر سلام کیا ۔

زلفی نے ایسی خوبصورتی سے اپنے بڑے بوڑھوں کا شکریہ ادا کیا۔ کہ اس کی پیاری باتوں پر سب لوٹ گئے۔ اور بھالو تو ایسا خوش ہوا۔ کہ بار بار گلا صاف کر کے شاباش شاباش کے نعرے

اژدہے کی طرف دیکھنے لگے۔ اور اب اژدہے نے پکار کر کہا۔ "بندرو بندرو۔ دیکھتے ہو کہ چاند ڈوبتا ہے۔ بتاؤ کہ اتنی چاندنی میں تمہیں کچھ سوجھتا ہے یا نہیں؟"

صدہا بندروں کی آواز نہایت غمگین جیسے ہوا درختوں میں ہچکیاں لیتی ہو درو دیوار سے آئی "اے اژدہے۔ ہاں سوائے تیرے ہمیں کچھ نہیں سوجھتا"

اژدھا ۔ اچھا تو اب دیکھو۔ کہ ہم بھوک سے بے تاب ہو کر خاک پر لوٹتے ہیں۔ اور یہ ہمارا وہ ناچ ہے جو بندر کھانے سے پہلے ہم ناچا کرتے ہیں۔

اور اب رقصِ اژدر جو سترہ فاقوں کے بعد اژدہا ناچا کرتا تھا۔ شروع ہوا۔ ہموار زمین دیکھ کر پہلے بڑے کنڈل میں پھن کو دائیں بائیں لہرا کر دوڑنے لگا۔ پھر زمین پر منہ مارتا ایک کنڈل سے نکل کر دوسرے کنڈل میں پہنچا۔ اور پھر پہلے کنڈل میں آیا۔ اور جب سب چکر پورے کر لئے۔ تو سیدھا ہو کر دم کے پاس ایک چھوٹا سا حلقہ بنایا اور اس تیزی سے لپٹتا ہوا گردن تک آیا۔ جیسے کوئی چرخ پر پہیہ چڑھاتا ہو۔

پھر کچھ دور تک کھل کر عجیب عجیب صورت کے پیچ و خم کھا کر

ایک شکل سے دُوسری شکل میں ڈھلنے لگا۔ جسم کے کسی حصّہ کو سکون نہ تھا۔ اور کوئی نقش نہ تھا۔ کہ بنتے ہی بدل نہ جاتا ہو۔ کبھی بدن کو لڑیوں کی طرح بن کر چٹیا سی گوندھ لیتا۔ کبھی طرح طرح کے خُوبصورت لہریئے زنجیرے بنا کر خاک پر کشیدہ کاڑھتا۔ کبھی اُلجھ کر بالکل گورکھ دھندا معلوم ہونے لگتا۔ اور کبھی سُلجھ کر اینٹوں کے اُونچے اُونچے ٹھئے زمین پر لگا دیتا۔ اور کنڈلیوں کے مورچوں پر پھن کا چتد کھول کھول کر لال لال آنکھوں سے بندروں کی طرف دیکھنے لگتا ۔

لوٹنے اور گھسٹنے کی آواز کے ساتھ پُھنکاروں کا لہرا کہیں نہ تھمتا تھا۔ اور تنفّس کا یہ عالم تھا۔ جیسے دیگ میں پانی جوش کھاتا ہو یہاں تک کہ چاندنی مٹنے لگی۔ اور خاک پہ لوٹنے کے نشان بھی دھندلے ہو گئے۔ اور تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو کر فقط زمین پر کسی چیز کے رگڑنے اور گھسٹنے کی آواز باقی رہ گئی ۔

بھالو اور بگھیرا یہ تماشا دیکھتے دیکھتے بالکل پتھر کی مُورتیں بن گئے گردن کے بال سیکوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ حلق ہی حلق میں غرّاتے تھے۔ مگر ہاتھ پاؤں میں حرکت کی قوّت باقی نہ رہی تھی۔ زلفی حیران تھا۔ کہ ان دونوں کی یہ کیا حالت ہوتی جاتی ہے ۔

جیسا من بھاتا چارہ کہاں ملے "۔

زلفی ان باتوں کا مطلب خاک نہ سمجھا۔ اس کو کچھ خبر نہ تھی۔ کہ اژدہے کی نظر جانوروں پر کس بلا کا اثر رکھتی ہے۔ بار بار پوچھتا تھا۔ کہ آپ اس قدر کیوں پریشان ہو گئے تھے۔ وہ بات ہی کیا تھی ایک لمبا سا سانپ زمین پر لوٹ رہا تھا۔ اور اس کی ناک زخمی ہو رہی تھی ۔

بگھیرا بگڑ کر بولا "۔ ناک زخمی ہو رہی تھی۔ مگر کس کی وجہ سے یہ تمہارے کرتوت ہیں۔ کہ اپنوں اور بیگانوں سب کو زخمی کر دیا۔ اژدہے کی ناک ٹوٹی۔ میری اور بھالو کی پوستین قابلِ رفو نہ رہی۔ اور تمہارا تو ظاہر ہے۔ ایک کھیل تھا۔ اب کس میں دم رہا ہے کہ خوش ہو کر جنگل میں شکار کھیلے ؟ اس صدمے سے سنبھلنے کو بھی مہینوں چاہئیں "۔

بھالو بولا "۔ جانے بھی دو۔ جیتے ہیں۔ تو شکار بھی ہو رہے گا۔ زلفی تو زندہ سلامت مل گیا۔ اور کیا چاہتے تھے ؟"

بگھیرا ۔ اس میں کس کو کلام ہے ؟ لیکن وقت کا بھی تو خیال کیجئے۔ کہ کس قدر ضائع ہوا ہے۔ اگر یہی وقت شکار میں صرف ہوتا تو کیا خوب ہوتا۔ میرا درجہ نہ سہی اپنا درجہ تو دیکھئے۔ اب کون

جیتا بیٹھا ہے۔ کہ اس اُدھڑے کمبل کو بیٹھ کر گانٹھے گا؟ پُشت سے کمر تک بیسیوں جگہ جیتا چمڑا نکل آیا ہے۔ اچھا۔ اور پھر یہ نقصان بھی سب سہے۔ عزت جو کچھ خاک میں ملی وہ کہاں سے پیدا ہو گی؟ زلفی آج تُو نے ہمارا وہ درجہ کیا ہے۔ کہ ہم میں بیان کی طاقت نہیں! مَیں نسلِ پینگ کا نام لیوا۔ اور بندروں سے لڑنے میں ایسا گھبرا جاؤں۔ کہ اژدہے کا نام لوُں۔ اور سانپوں سے پناہ مانگوں؟ اور اژدہے کا ناچ دیکھ کر ایسا مدہوش اور بدحواس ہو جاؤں۔ کہ تن بدن کی کچھ خبر نہ رہے؟ یہ وہ باتیں ہیں۔ جو آج سے پہلے نہ کبھی سُنی تھیں نہ دیکھی تھیں۔ افسوس! یہ جتنی رُسوائی ہوئی ہے۔ تیری وجہ سے ہوئی ہے۔ نہ تُو بندروں سے آشنائی کرتا۔ نہ ہم اس حال کو پہنچتے"۔

زلفی نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

بھالو کڑک کر بولے "بتاؤ جنگل کی پوتھی اس قصور کی سزا میں کیا کہتی ہے؟"

بھالو کا جی تو نہیں چاہتا تھا۔ کہ زلفی کو سخت سزا دی جائے لیکن قانون کی پابندی ہر صورت میں لازم تھی۔ زلفی اپنی حرکتوں پر پشیمان تھا۔ لیکن پشیمانی سے سزا تو ٹل نہیں سکتی۔ بھالو نے بگھیرے

سے کہا: "دیکھو۔ سزا کے وقت اس کا لحاظ رہے۔ کہ لڑکا کمزور اور نادان ہے"۔

بگھیرا ۔ بے شک سزا کے وقت اس کا لحاظ کیا جائے گا لیکن اس کے قصور میں کچھ شبہ نہیں۔ زلفی تمہارا جرم ثابت ہے۔ اگر تم کو کچھ کہنا ہے تو کہو۔ کہ تم کو سزا نہ دی جائے؟

زلفی نے جواب دیا "مجھ کو کچھ نہیں کہنا۔ آپ جو سزا دیں گے وہ مناسب ہوگی۔ اور انصاف کا خون نہ ہوگا"۔

یہ سُن کر بگھیرے نے ایک پنجہ اُٹھایا۔ اور ناخن چھپا کر اُلٹے ہاتھ سے تین چار پیار کے طمانچے لگائے۔ بگھیرے کے نزدیک یہ بہت پیار کی سزا تھی۔ لیکن سات برس کے بچے کے حق میں یہ سزا ایسی سخت تھی۔ کہ جیسے کسی مکتب کے لڑکے کو بڑے زور کی مار پڑی ہو۔

جب مار پٹ چکی۔ تو زلفی دو چار چھینکیں لے زمین سے اُٹھا۔ اور بگھیرے نے اس کو پیار کر کے کہا: "آؤ زلفی آؤ۔ میری پیٹھ پر لیٹ رہو۔ اور اب ہم گھر چلتے ہیں"۔

جنگل کے قانون میں یہ بڑی خوبی تھی۔ کہ جہاں کسی قصور کی سزا مل گئی۔ پھر کسی کے دِل میں کچھ غبار نہ رہتا تھا۔

اوقات ضائع کرنی تو بھیڑیے کو آتی نہ تھی۔ دشمن پر پہنچتے ہی زلفی کے گرد بندروں کے دل بادل میں پنجے اور ناخن سے خنجر و شمشیر کا کام لینے لگا۔ کوئی چنگل ایسا نہ تھا۔ کہ طمانچہ نہ چلاتا ہو۔ اور کوئی ناخن نہ تھا۔ کہ ایک اشارہ میں دو چار بندروں کی رُوح نہ کھینچ لیتا ہو۔ شور پر ایک اُور شور خوف و عتاب کا پیدا نہ ہوا تھا۔ کہ سینکڑوں بندر زخمی ہو کر خاک پر پڑے ہاتھ پاؤں پٹیخنے لگے۔ اور بھیڑیا بندروں کی رُوئی سی دُھنکتا لاشوں کو روندتا کچلتا آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ کہ ایک نے للکار کر کہا۔ "یارو کیوں جانیں مفت میں کھوتے ہو۔ دشمن فقط ایک ہے اور ہم لاکھوں"۔

اِس للکار کے سُنتے ہی اُترتے کے گھاٹوں سے بندروں کی ایک بلاخیز موج تڑپتی اور لوٹتی سمٹتی اور بکھرتی ایسی تیرہ و تار آئی۔ کہ بھیڑیا بندروں کے اس گرداب میں چھپ کر نظر سے غائب ہو گیا۔ اور دس بارہ بندر دوڑتے ہوئے زلفی کی طرف آئے اور اس کو پکڑ کر کسی رستہ سے تال کے بیچ بارہ دری کے بُرج پر لے چڑھے۔ اور جہاں سے بُرج ٹوٹ گیا تھا وہاں سے زلفی کو دھکا دے بارہ دری کے اندر گرا دیا ۔

زلفی نے اگر آدمیوں میں پرورش پائی ہوتی۔ تو پانچ چھ گز